تورات کی تدوین کا "دستاویزی نظریہ": ایک تنقیدی جائزہ

محمد مشتاق احمد☆

Majority of the Muslim scholars is of the view that the Torah was revealed all at once. Hence, the Muslim tradition of criticism on the Torah generally remains confined to pointing out contradictions and other forms of corruption in the text of the first five scriptures of the Bible, i.e., the Pentateuch, which the Judeo-Christian tradition considers as the Torah. Contrary to this, the Western tradition of Biblical criticism developed in the last three centuries has resulted in expounding various theories regarding the authorship, compilation and redaction of the Pentateuch. The most important of these theories is the so-called "documentary theory", which has generally been accepted by the Western scholars as the starting point for critical study of the Bible. This theory supposes the existence of at least four different sources behind the text of the Pentateuch and suggests that the Pentateuch attained its present form many centuries after the death of Musa (peace be on him). While this conclusion strengthens the Muslim view about the corruption and interpolation in the text of the Torah, this theory has many

☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IRI, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

other implications which are certainly not acceptable to Muslims. These include, inter alia, negation of revelation, denial of miracles and predictions, presuming that religion evolved from polytheism to monotheism and moral indifference. Hence, instead of relying solely on the Western tradition of Biblical criticism, Muslim scholars should come up with a theory (or theories) of their own for criticism on the Pentateuch and determining the authentic text of the Torah. The present paper highlights this issue and contends that the Muslim approach towards the Torah is altogether different from the Western tradition of Biblical criticism even if the two sides sometimes agree on certain conclusions.

تورات کے متعلق عام طور پر مسلمان اہلِ علم کا موقف یہ رہا ہے کہ اس کا نزول سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر یکبارگی ہوا، نہ کہ تدریجاً۔ [۱] یکبارگی نزول کے اس نظریے پر ہم ایک دوسرے مقام پر تفصیلی تنقید کر چکے ہیں۔[۲] زیرِ نظر مقالے میں ہم تدوینِ تورات کے متعلق مغربی محققین کے ہاں عام طور پر رائج ''دستاویزی نظریے'' (Documnetary Theory) کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔ تاہم آگے بڑھنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ تورات کے متعلق یہودیوں اور مسیحیوں کا تصور مسلمانوں کے تصور سے مختلف ہے۔ مسلمان اس کتاب کو تورات کہتے ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کے ذریعے نازل کی گئی،[۳] جبکہ یہودی اور مسیحی اپنی ''کتاب مقدس'' (The Holy Bible) کے ابتدائی

۱- اس رائے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر محمود احمد غازی، **''قرآن: انداز نزول کی حکمت''**، ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' لاہور، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ۲۱-۳۵

۲- محمد مشتاق احمد، **''توریت کا نزول یکبارگی ہوا ہے یا تدریجاً؟''**، سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ، ج ۳۱، ش ۳ (جولائی-ستمبر ۲۰۱۲ء)، ص ۳۳-۵۶

۳- قرآن مجید نے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی تھی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں: **المؤمنون**، آیت ۴۹ اور **القصص**، آیت ۴۳۔ اسی طرح قرآن مجید نے کئی جگہ تورات کی عظمت بیان کی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں: **المائدہ**، آیت ۴۴ اور **الأعراف**، آیات ۱۴۴-۱۴۵

پانچ اسفار کے مجموعے (Pentateuch) کو تورات کہتے ہیں۔[۴] مسلمان اہلِ علم کا عام طور پر موقف یہ ہے کہ اصل تورات کا بہت حصہ مختلف اسباب کی بنا پر ضائع ہو چکا ہے اور موجودہ اسفارِ خمسہ میں اس کے کچھ ہی حصے منتشر صورت میں پائے جاتے ہیں۔[۵] اس لیے تورات کے نزول یا تدوین پر کی جانے والی کسی بھی بحث میں ہمیشہ سے اسفارِ خمسہ کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

روایتی طور پر یہودی اور مسیحی علما کا موقف یہ رہا ہے کہ ان اسفارِ خمسہ کے مصنف سیدنا موسیٰ علیہ السلام

۴- ان میں پہلا صحیفہ ''پیدائش'' کائنات کی تخلیق کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور پھر سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق اور سیدنا نوح و سیدنا ابراہیم علیہما السلام کی سوانح کے بعض واقعات سے ہوتے ہوتے سیدنا یوسف علیہ السلام کی وفات کے تذکرے پر ختم ہوجاتا ہے۔ دوسرے صحیفے ''خروج'' سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو ''احبار''، ''گنتی'' اور ''استثناء'' میں جاری رہتا ہے۔ موخر الذکر کتاب کے آخر میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا تذکرہ ہے۔

۵- مثال کے طور پر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) لکھتے ہیں:

''دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے......اس کتاب کا نام ''تورات'' تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی تک محفوظ تھی...... اس سے ان کی غفلت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا، اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہو...... پھر جب عزرا کاہن (عزیر) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کچھے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا، تو عزرا نے اپنی قوم کے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی جو اب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب یعنی خروج، احبار، گنتی اور استثنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت میں ہی تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہوسکیں۔'' (**تفہیم القرآن**، لاہور: ادارۂ ترجمان القرآن، ۱۹۷۴ء، ج ۱، ص ۲۳۱-۲۳۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی تورات کے تدریجی نزول کے قائل تھے۔ یہی رائے مولانا امین احسن اصلاحی (م ۱۹۹۷ء) کی ہے جو انھوں نے سورۃ الفرقان کی تفسیر میں پیش کی ہے۔ (**تدبر قرآن**، لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱ء، ج ۵، ص ۴۶۳) مولانا عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) بھی اس کے قائل تھے۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، **ترتیب و تدوین**، محمد سرور، لاہور: الحمود اکیڈمی، تاریخ ندارد، ص ۱۰۱-۱۰۵، اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے راقم کا مقالہ بہ عنوان ''نزول و تدوینِ تورات: مسلمان اہلِ علم کی آرا کا تنقیدی جائزہ'' (منتظرِ طبع)

ہیں اور یہ کہ انھوں نے الہام کے نتیجے میں انھیں تصنیف کیا تھا۔[۶] زمانۂ قدیم سے ہی بعض یہودی اور مسیحی اہلِ علم اس روایتی نظریے پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ مثلاً چھٹی صدی عیسوی میں بعض ربیوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سِفر استثنا کا باب ۳۴ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تصنیف نہیں کیا تھا کیونکہ اس میں ان کی وفات کا تذکرہ ہے۔[۷] ایک عام رائے یہ ظاہر کی گئی کہ یہ باب سیدنا یوشع علیہ السلام نے تحریر کیا تھا اور یہ گویا سفر یوشع کا پہلا باب ہے۔ اسی طرح اسفارِ خمسہ میں کئی ایسے مقامات کے نام پائے جاتے ہیں جن تک سیدنا موسیٰ علیہ السلام نہیں پہنچ پائے تھے، یا جن کا وہ نام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نہیں تھا۔ اسی طرح ان میں ایسے واقعات کی طرف اشارات بھی ملتے ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔ اسفارِ خمسہ میں مذکور بعض قوانین بھی ایسے ہیں جن کا صحرائی بدوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب بنی اسرائیل نے صحرا نوردی ترک کر کے بستیاں آباد کر لی تھیں۔ اسی طرح ان اسفار میں بسا اوقات اسالیب بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں اور پوری کتاب کو ایک ہی مصنف کی تحریر نہیں مانا جاسکتا۔ نیز بسا اوقات ایک ہی واقعے کے متعلق دو یا تین روایات ان اسفار میں مذکور ہوتی ہیں جن کو بعض اوقات ملا کر ایک ہی روایت کی شکل دی گئی ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ روایات بالکل ہی الگ موجود ہوتی ہیں۔

گزشتہ ڈھائی صدیوں میں تحقیقات اور تنقیدی مطالعے کے بعد اس خیال کو محققین کلیتاً مسترد کر چکے ہیں کہ اسفارِ خمسہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تصنیف کردہ ہیں۔ تدوینِ تورات کے متعلق یوں تو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں، تاہم جس نظریے نے بہت مقبولیت حاصل کی اور جسے کسی نہ کسی درجے میں تقریباً سبھی محققین تسلیم کرتے ہیں وہ ''دستاویزی نظریہ'' ہے۔ اس نظریے کے فہم کے لیے بائبل پر مغرب میں کی جانے والی تنقیدِ جدید سے آگاہی ضروری ہے۔

۶- ''تورات'' کے لغوی معنی ''قانون'' یا ''شریعت'' کے ہیں۔ یہودی و مسیحی محاورے میں ''شریعت''، ''موسیٰ کی شریعت''، ''موسیٰ کی کتاب'' اور ''شریعت کی کتاب'' سے مراد تورات ہوتی ہے۔ اسفارِ خمسہ میں کئی مقامات پر مذکور ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی جانب سے کی گئی وحی تحریری صورت میں محفوظ کی۔ (خروج: باب ۱۷، آیت ۱۴؛ باب ۲۴، آیت ۴؛ باب ۳۴، آیت ۷؛ استثنا: باب ۳۱، آیت ۹)

۷- دیکھیے: James King West, *Introduction to the Old Testament*(North Carolina: Catawba College, 1971), p 35

فصل اول

تنقید ابتدائی (Lower Criticism)

تنقید جدید کا پہلا مقصد اصل عبرانی متن کی تعیین ہے۔[۸] عزرا کے زمانے سے صحائف کی کتابت کا کام جن لوگوں کے سپرد کیا گیا انھیں عبرانی زبان میں "سُفریم" (بمعنی کاتبین) کہاجا تا تھا۔[۹] یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عبرانی زبان میں صرف حروف صحیحہ (Consonants) ہے اور اس میں حروف علت (Wovels) نہیں پائے جاتے۔جس زمانے میں یہ سُفریم کتابت کرتے تھے اس وقت اعراب (زیر، زبر، پیش یا سکون) بھی وضع نہیں کیے گئے تھے۔ اس لیے بعد کے دور میں جب عبرانی زبان صرف کتابوں اور چند علما تک ہی محدود ہوگئی اور بولی جانے والی زبان (Spoken Language) کے طور پر باقی نہیں رہی تو ایک ہی لفظ کو مختلف اعراب لگا کر مختلف انداز میں پڑھنا ممکن ہوگیا۔ اس کی چند مثالیں ہم آگے ذکر کریں گے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سُفریم نے آیات اور ابواب کی تقسیم بھی نہیں کی۔

سُفریم سے کتابت اور نقل میں سماعت اور بصارت کی غلطیاں ہوتی تھیں اور مغربی محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان غلطیوں میں بعض قصداً بھی ہوتی تھیں اور یہ کہ ان میں بہت سی غلطیاں متون میں داخل بھی ہوگئی ہیں۔ ان دانستہ و نادانستہ غلطیوں کی کئی قسمیں ہیں، جن میں کچھ یہاں ذکر کی جاتی ہیں :

۱- بعض اوقات ایک ہی لفظ یا حرف غلطی سے دوبار لکھا گیا۔ اسے Dittography کہتے ہیں۔

۲- کبھی ایک ہی لفظ دو جملوں میں آیا ہوتا ہے تو کاتب دونوں مقامات کے درمیان آنے والے الفاظ نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسے Homoioteleuton کہا جاتا ہے۔

۳- بعض اوقات عبرانی زبان کے بعض حروف تہجی کی مشابہت غلطی کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً عبرانی زبان میں ''نون'' اور ''ریش'' (عربی راء) میں بہت ہی معمولی فرق ہے۔ اسی وجہ سے بابل کے بادشاہ نبوخدرضر کا نام نبوخدنضر لکھا گیا۔

۸- تنقید جدید کے متعلق یہ تفصیل بنیادی طور پر جیمز کنگ ویسٹ کی محولہ بالا کتاب *Introduction to the Old Testament* سے اخذ کی گئی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :

H. F., Hahn, *The Old Testament in Modern Research*,(London: SCM Press, 1956)

۹- دلچسپ امر یہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی کاتبین وحی کو "سَفَرَة" کا نام دیا ہے۔ (سورۃ عبس، آیت۱۵)

۴- کتابت چونکہ املا کے ذریعے بھی کی جاتی تھی، اس لیے آواز میں مشابہت بھی غلطی کا باعث بن جاتی تھی۔ مثلاً عبرانی میں نفی کے لیے عربی کی طرح حرف ''لا'' استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا تلفظ تقریباً ''لو'' کی طرح ہوتا ہے۔ اسی سے قریب تلفظ ایک اور حرف ''لوٗ'' کا ہے جس کا مفہوم ہے ''کے لیے'' (عربی میں حرف لام مفتوح لَ ، یا لام مکسور لِ)۔ (۱۰)

۵- بعض اوقات سفریم دانستہ بھی لفظ تبدیل کر لیتے تھے۔ یہ دانستہ تبدیلی بعض اوقات اس وجہ سے ہوتی ہے کہ کاتب کے نزدیک لفظ غلط لکھا یا کہا گیا تھا چنانچہ وہ اپنی دانست میں اس کی تصحیح کر دیتا ہے، اور کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ متن میں مذکور لفظ کاتب کے عقیدے یا نظریے سے ٹکراتا ہے۔ مثلاً مغربی محققین کی تحقیق یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ ساؤل (جسے قرآن مجید نے اس کی جسامت کی

۱۰- علوم الحدیث کے طلبہ کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ روایات میں بعض اوقات قولِ رسول کی روایت کے ساتھ راوی کے الفاظ بھی شامل ہوجاتے ہیں اور ان کو اصل متن سے الگ کرنے کے لیے محدثین نے اصول وضع کیے ہیں۔ اسی طرح اسفارِ خمسہ میں بھی اصل روایت کے متن میں راویوں کی طرف سے اضافے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں محدثانہ اصولوں کے ذریعے الگ کیا جاسکتا ہے۔ ان اصولوں کی مدد سے اسفارِ خمسہ میں بھی روایت کے اصل متن تک رسائی ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر روایت کی سند یا متن میں ایسا اضافہ جو اصل متن کا حصہ نہ ہو ادراج کہلاتا ہے اور ایسی روایت کو مُدرَج کہتے ہیں۔ روایت کی سند یا متن تقدیم و تاخیر کو قلب اور ایسی روایت کو مقلوب کہتے ہیں۔ اگر روایت مختلف طرق سے کی جائے اور ان میں کسی طریق کو دوسرے طریق پر ترجیح نہ دی جاسکے تو اس قسم کے اختلاف کو اضطراب کہتے ہیں اور ایسی روایت کو مضطرب کہتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کو ثقہ راوی نے غلطی سے یوں بدل دیا ہو کہ یا تو لفظ ہی تبدیل ہوگیا ہو یا اس کا مفہوم تبدیل ہوگیا ہو تو اسے مُصَحَّف اور ایسی تبدیلی کو تصحیف کہتے ہیں۔ محدثین نے تصحیف کے تقریباً وہی اسباب لکھے ہیں جو سفریم کے حوالے سے اوپر ذکر کیے گئے۔ مثلاً ایک سبب بینائی کی کمزوری ہے۔ اسی طرح کبھی سماعت کی کمزوری یا شیخ سے دوری کے سبب سے لفظ کے سننے میں اشتباہ واقع ہوجاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الحافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن محمد ابن حجر العسقلانی، شرح نخبۃ الفکر (دہلی: المطبع المجتبائی، ۱۳۴۴ھ، ص ۶۱-۶۸) نیز اکثر احادیث کی روایت بالمعنی ہوئی ہے، اس لیے بعض اوقات روایات میں تعارض بھی پیدا ہوجاتا ہے جس کے رفع کرنے کے لیے محدثین نے بڑی محنت سے اصول وضع کیے ہیں اور ''مختلف الحدیث'' تو ایک مستقل فن ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابومحمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ، تأویل مختلف الحدیث، تحقیق أبو أسامۃ سلیم بن عید الھلالی (الریاض: دار ابن القیم، ۲۰۰۹م)۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسفارِ خمسہ میں ادراج، قلب، اضطراب اور تصحیف کے مسائل سے نمٹنے اور اختلاف روایات و تعارض رفع کرکے اصل متن تک رسائی کے سلسلے میں محدثین کے اصول نہایت مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ کاش مسلمان اہل علم مناظرانہ انداز اسفارِ خمسہ کے تضادات ڈھونڈنے کے بجائے محدثانہ انداز میں ان تضادات کا حل نکال کر اصل متن تک رسائی کی کوشش کی طرف بھی کچھ توجہ دیں!

وجہ سے ''طالوت'' کے نام سے ذکر کیا ہے) کے بیٹے کا اصل نام اِش بعل تھا، جس کا مفہوم تھا ''بعل کا آدمی''۔ اسے مشرکانہ نام تصور کر کے کسی کاتب نے اِش بوشت (ذلت کا آدمی) کردیا۔ (١١)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے مطابق عبرانی متن کی تحریر میں درج ذیل نوعیت کی غلطیاں ہوئیں:

۱-لفظ سننے میں غلطی

مثلاً حرف نفی ''لو''کو حرف جر ''لو''سمجھنا۔ اسی طرح عبرانی تلفظ میں لفظ ''کاف '' دو طرح سے بولا جاتا تھا: ایک تو عربی کاف ہی کی طرح اور ایک عبرانی ''خیـــــت'' (عربی خاء) کی طرح۔ چنانچہ ایک سامع لفظ ''اخ '' میں خاء کی آواز کو خیت سمجھ کر اسے ''بھائی '' لکھ سکتا تھا، جبکہ کوئی اور سامع اسے لفظ کاف سمجھ کر ''یقیناً'' لکھ سکتا تھا۔

۲- دیکھنے میں غلطی

بعض عبرانی حروف ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتے ہیں، مثلاً حرف ''بیت'' (عربی باء) اور حرف کاف۔ اس قسم کی غلطی کی وجہ سے عبرانی بائبل کے مسوراتی متن (آگے اس کی تشریح آرہی ہے۔) اور بحر مردار کے طوماروں (اس کی تشریح بھی آگے آرہی ہے۔) میں بعض الفاظ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں کئی نوعیت کی ہوتی تھیں:

(الف) کبھی لفظ میں کوئی حرف آگے پیچھے ہوجاتا تھا۔ مثلاً قـربـم (ان کے اندرونی خیالات) کی جگہ قبـرم (ان کی قبر) لکھا گیا۔

ب) کبھی ایک ہی حرف یا لفظ دو دفعہ لکھا گیا۔

ج) کبھی ایک ہی جملے میں ایک لفظ دوبار آیا ہے تو ان الفاظ کے درمیان کے الفاظ چھوٹ گئے۔

د) کبھی دو جملے ایک ہی لفظ پر ختم ہوتے ہیں تو کاتب ایک جملے کے بجائے دوسرے کو دیکھ کر اس کے

١١- ہمارے محدثین نے وضع حدیث کے جو اسباب ذکر کیے ہیں ان میں ایک سبب یہی ''دینداری اور تقرب الی اللہ'' ہے۔ دیگر اسباب جو محدثین نے ذکر کیے ہیں وہ بھی یہاں ذکر کیے جاتے ہیں کیونکہ ان اسباب کی کارفرمائی بائبل کی بعض روایات میں بھی نظر آتی ہے۔ ان میں اہم اسباب یہ ہیں : اپنے مخصوص نظریے یا تصور کو تقویت دینا، دین حق کو مسخ کرنا، دنیوی مفادات کا حصول بالخصوص حکمران طبقے کی خوشنودی، شہرت طلبی، تلاش معاش کے لیے قصے کہانیاں وضع کرنا تاکہ لوگ انہیں سن کر قصہ گو کو کچھ رقم دیں وغیرہ۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے : شرح نخبۃ الفکر، ص ٥٦-٥٩۔ نیز دیکھیے: جلال الدین السیوطی، اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة (دمشق : دار الفکر، ١٩٧٠ء)

بعد لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

۳- اعراب اور تلفظ کی غلطی

اعراب کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایک لفظ کا تلفظ دو یا زائد طریقوں پر ممکن ہوتا تھا۔ ایسے میں کاتب اپنے طور پر مناسب تلفظ اختیار کر لیتا تھا۔ مثلاً ایک کاتب نے لفظ د ب ر کو فعل سمجھا (اس نے کہا)، اور دوسرے نے اسے مصدر (بات) سمجھ لیا۔ نیز چونکہ رموز اوقاف بھی نہیں تھے اس لیے ایک ہی لفظ کو دو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ممکن تھا۔ مثلاً ب ب ق ر ی م کو کسی نے ببقریم سمجھ لیا (بیلوں کے ساتھ)، اور دوسرے نے اسے ببقر یم سمجھ لیا (بیل اور سمندر کے ساتھ)۔

۴-قصداً غلطی

کبھی کاتب متن میں اپنے طور پر تصحیح بھی کر لیتے تھے۔ مثلاً کسی مبہم لفظ کی جگہ آسان اور عام فہم لفظ لکھ دیا، یا کسی لفظ کی تشریح کر دی جو کبھی حاشیے پر لکھ دی جاتی اور کبھی متن میں ہی، کبھی حاشیے کے الفاظ متن میں داخل کر دیے جاتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کاتب کے سامنے ایک سے زائد مخطوطات ہوتے تھے اور وہ اختلاف کی صورت میں کسی ایک کو ترجیح نہیں دے پاتا تھا تو دونوں کو ہی درج کر دیتا تھا۔[۱۲]

اس طرح کی غلطیوں اور تبدیلیوں کی وجہ سے ایک ہی صحیفے کی مختلف روایات گردش کرنے لگتیں۔ دوسری زبانوں میں تراجم کا انحصار انھی میں روایت شدہ کسی نسخے پر ہوتا تھا اور مترجم کے اپنے بھی مسائل ہوتے ہیں، اس لیے ایک ہی آیت کے کئی مفاہیم سامنے آ گئے۔ اصل متن کے قریب تر پہنچنا تنقید جدید کے پہلے شعبے کا کام ہے۔ اس وجہ سے اسے ''متن کی تنقید'' (Textual Criticism) کہا جاتا ہے۔ اسے ''تنقید ابتدائی'' (Lower Criticism) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اصل متن کی نشاندہی کے بعد تنقید کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے جسے ''تنقید عالی'' (Higher Criticism) کہا جاتا ہے۔

عبرانی مسوراتی متن (Masoretic Text/ MT)

صحیح متن کی دریافت کے لیے ماہرین عام طور پر مسوراتی علما (Masoretic Scholars) کے وضع کردہ ''مستند متن'' کو بنیاد بناتے ہیں۔ یہ چھٹی اور گیارھویں صدی عیسوی کے درمیانی عہد سے تعلق رکھنے

۱۲- تفصیل کے لیے دیکھیے: *Encyclopedia Britannica*, (University of Chicago, 1988), 15th Edition, vol. 3, pp 759ff

والے یہودی علما تھے جنھوں نے عبرانی متن میں اعراب لگا کر سفریم کے کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ عبرانی زبان میں ''مسورۃ'' کا مطلب روایت ہے۔(۱۳) اس وقت دستیاب قدیم ترین مسوراتی متن، جس میں پوری یہودی بائبل موجود ہے، لینن گراڈ بائبل ہے جسے ۱۰۰۸ء کی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔

بحر مردار کے طومار (Dead Sea Scrolls)

متن کی تنقید کے لیے ماہرین مسوراتی متن سے دیگر قدیم متون اور تراجم کا موازنہ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بحر مردار کے کنارے واقع وادئ قمران میں بائبل کے قدیم طوماروں کی دریافت سے قبل تک صورتحال یہ تھی کہ قدیم ترین عبرانی نسخہ نویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا قطعہ ایسا تھا جو پہلی صدی عیسوی کا تھا۔ اس میں سفر خروج باب ۲۰ اور سفر استثنا باب ۵ اور ۶ کے چند جملے تھے۔ وادئ قمران میں جو طومار ملے وہ پہلی اور دوسری صدی قبل از مسیح سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سفر آستر کے ماسوا یہودی بائبل کے تمام صحائف کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ سفر احبار، سفر اشعیا اور مزامیر (زبور) کے نسبتاً بڑے ٹکڑے ملے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی مدد سے پرانے تراجم پر نظر ثانی بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ انگریزی بائبل کے ''نظر ثانی شدہ مستند نسخے'' (Revised Standard Version/RSV) میں کم از کم ۱۳ مقامات ایسے ہیں جن میں مترجمین نے اختلاف روایت کی صورت میں ان ٹکڑوں کو مسوراتی متن پر ترجیح دی ہے۔(۱۴)

یونانی ہفتادی ترجمہ (Septuagent/LXX)

بائبل کے قدیم تراجم سے بھی متن پر تنقید کے کام میں مدد لی جاتی ہے۔ ان تراجم میں سب سے اہم یونانی ''ہفتادی ترجمہ'' ہے، جسے یونانی بولنے والے یہودی علما نے پہلی اور دوسری صدی قبل از مسیح میں مصر میں کیا تھا۔ اس ترجمے میں ۲۔عزرا کے ماسوا وہ تمام صحائف بھی شامل ہیں جنھیں ''متنازعہ/خفیہ اسفار''

۱۳- بائبل کے مسوراتی متن اور دیگر نسخوں پر ایک تحقیقی مطالعے کے لیے دیکھیے : Roberts Bleddyn, *The Old Testament Texts and and Versions:* The Hebrew Texts in Transmission and the History of the Ancient Versions, (Cardiff: University of Wales Press, 1951)

۱۴- بحر مردار کے طوماروں کی دریافت اور ان کے متن پر ایک تحقیقی مطالعے کے لیے دیکھیے : Frank Moore Cross, *The Ancient Library of Qumran and Modern Biblical Studies*(New York: Doubleday and Co, 1961)

ان طوماروں کے متعلق بائبل کے علما کی تحقیقات پر تنقید کے لیے دیکھیے:

M. Baigent and R. Leigh, *The Dead Sea Scrolls Deception* (London: Jonathan Cape, 1991)

(Apocrypha) کہاجاتا ہے۔[۱۴ الف] وادیٔ قمران کے طومار بعض مقامات پر اس ترجمے سے اور بعض پر مسوراتی متن سے موافقت رکھتے ہیں۔[۱۵]

ارامی ترجوم (Targom)

اس سلسلے میں ایک اور اہم ماخذ ارامی زبان کے ”تـرجوم“ (تراجم) ہیں۔ بابل جلاوطنی کے بعد جب عبرانی زبان بولنے میں باقی نہیں رہی اور اس کی جگہ ارامی زبان نے لی تو یہودی علما نے یہ سلسلہ شروع کیا کہ عبادت خانوں میں پہلے عبرانی متن پڑھتے تھے پھر اس کا مفہوم ارامی زبان میں بیان کرتے تھے۔ تیسری صدی قبل از مسیح سے شروع ہونے والے ان ترجوم کو سیدنا مسیح علیہ السلام کی بعثت کے بہت عرصے بعد تحریری شکل دی گئی۔ تورات کا ترجوم ایک ایک آیت کی تشریح پر مشتمل تھا جبکہ صحائف انبیا کا ترجوم تین تین آیات کی تشریح پر مبنی تھا۔ ترجوم کا عام استعمال نویں صدی عیسوی تک جاری رہا جس کے بعد رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ البتہ جنوبی عرب میں آباد بعض یہود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ماضی قریب تک ترجوم پڑھتے تھے۔ اسی طرح بخارا کے یہودیوں کے متعلق بیان کیاجاتا ہے کہ وہ عبادت میں پہلے ترجوم پڑھتے، پھر اس کا فارسی ترجمہ پڑھتے۔[۱۶]

سریانی پشیطہ (Peshitta)

عیسائی علما نے ان صحائف کے جو تراجم کیے ان میں دو نے کافی اہمیت اور شہرت حاصل کرلی۔ ایک سریانی زبان میں ترجوم تھا پہلی صدی عیسوی کے آخر یا دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں کیا گیا۔ اس کو ”**پشیطہ**“ کہتے ہیں، جس کا ارامی زبان میں مطلب ہے ”سادہ“ یا ”عوامی“۔ **پشیطہ** پر ارامی ترجوم اور یونانی ہفتادی ترجمے کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ یہ ترجمہ سریانی عیسائیوں میں کم از کم چار صدیوں تک باقاعدہ رائج رہا۔[۱۷]

---

۱۴ الف- اپوکریفا کا لغوی مطلب ہے : چھپایا گیا، خفیہ، جس کا استناد مشکوک ہو۔ اصطلاحاً یہ عنوان ان صحائف کو دیا گیا ہے جو یہودی بائبل (یعنی مسیحی بائبل کے عہدنامۂ قدیم) میں شامل ہیں اور یہودیوں اور رومن کیتھولک مسیحیوں کے نزدیک مستند ہیں لیکن پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے نزدیک ان کا درجۂ استناد ایسا نہیں ہے کہ انھیں بائبل کا حصہ مان لیا جائے

۱۵- ایف ایس خیر اللہ، قاموس الکتاب (لاہور: مسیحی اشاعت خانہ، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۰۸۱۔ نیز دیکھیے :
Introduction to the Old Testament, pp 7-8

۱۶- قاموس الکتاب، ص ۲۲۰ ؛ *Introduction to the Old Testament*, pp 8-9

۱۷- قاموس الکتاب، ص ۱۹۰ ؛ *Introduction to the Old Testament*, p 9

لاطینی ولگاتا(Vulgate)

دوسرا مشہور ترجمہ ۳۸۲ء میں پوپ دماسس کے حکم پر مشہور عیسائی عالم سینٹ جیروم نے کیا تھا۔ اس کو ولگاتا (’عوام تک پہنچانا‘ یا ’عوامی اشاعت‘) کہا جاتا ہے۔ اس ترجمے کی اہمیت اور شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۵۴۶ء میں کونسل آف ٹرینٹ نے اس ترجمہ کو رومن کیتھولک کلیسا کے لیے واحد مستند لاطینی ترجمہ قرار دیا تھا۔ نیز ولیم ٹنڈیل کے انگریزی ترجمے (۱۵۲۹ء) تک تمام انگریزی تراجم کا انحصار ولگاتا پر ہی تھا۔[(۱۸)]

ماہرین ان متون اور تراجم کا آپس میں موازنہ کرکے یہ متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اصل متن کیا تھا۔ کبھی مسوراتی متن کو دیگر پر ترجیح دے دی جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ تراجم میں کسی کو اصل عبرانی متن پر ترجیح دے دی جاتی ہے۔ مثلاً اس سلسلے میں جیمز ویسٹ کہتے ہیں:

> [W]hen a versional reading differs from the MT the more authentic text must be determined on the basis of contextual meaning. Agreement between two or more versions against an MT reading strengthens the case for an emendation of the MT, but only if it results in improving the sense of the text.[(19)]

اس کی مثال یہ ہے کہ مسوراتی متن میں قائن (قابیل) کے یہ الفاظ موجود نہیں ہیں: ”آ کھیت کو چلیں“۔[(۲۰)]

تاہم یہ الفاظ سامریوں کی تورات، ہفتادی ترجمے، سریانی پشیطہ اور چند تغیرات کے ساتھ لاطینی ولگاتا میں موجود ہیں۔ چنانچہ RSV میں یہ الفاظ شامل کیے گئے ہیں، جبکہ KJV میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ پروٹسٹنٹ اردو ترجمے میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں جبکہ کیتھولک اردو ترجمے میں یہ الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔[(۲۱)]

۱۸- قاموس الکتاب، ص ۱۰۶۷؛ *Introduction to the Old Testament*, p 9

۱۹- *Introduction to the Old Testament*, p 9

۲۰- سفر پیدائش: باب ۴، آیت ۸

۲۱- علامہ رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب **”اظہار الحق“** میں تحریف کی قسم ”حذف الفاظ“ کے ضمن میں اس آیت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عبرانی متن سے یہ الفاظ حذف کیے گئے ہیں۔ دیکھئے: اردو ترجمہ: بائبل سے قرآن تک، مترجم مولانا اکبر علی، تحقیق مولانا محمد تقی عثمانی (کراچی: مکتبۂ دارالعلوم، ۱۹۹۲ء)، ج ۲ ص ۶۸۴-۶۸۵

تنقید جدید کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اکثر مقامات پر مسوراتی علما نے عبرانی متن پر جو اعراب لگائے ہیں وہ صحیح ہیں اور متن کا مفہوم صحیح طور پر ادا کرتے ہیں۔ تاہم کئی مقامات ایسے ہیں جہاں مسوراتی علما کے لگائے گئے اعراب صحیح نہیں ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ سِفر سلاطین میں سیدنا الیاس علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے کہ کوے ان کے لیے خوراک لایا کرتے تھے۔ (۱۔سلاطین : باب ۱۷، آیات ۴۔۷) بہت سے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہاں مسوراتی علما نے لفظ پر صحیح اعراب نہیں لگائے۔ اصل لفظ **عربیم** ہے۔ مسوراتی علما نے اس کا تلفظ **عـوربیـم** کیا جس کا مطلب ہے ''کوے'' (عربی میں غراب)۔ ناقدین کے نزدیک اس کا صحیح تلفظ **عَـربیـم** تھا، جس کا مطلب ہے ''عرب''۔ گویا ناقدین کے نزدیک متن کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ عرب ان کے لیے خوراک لایا کرتے تھے۔ [۲۲]

۲۲- مغربی محققین کے ان نظریات کی زد کہاں پڑ سکتی ہے؟ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ ماضیِ قریب میں لبنانی مؤرخ کمال صلیبی (م ۲۰۱۱ء) اسے اس کے منطقی نتائج تک پہنچا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بائبل میں مذکور واقعات کی اکثریت کا تعلق مصر یا فلسطین کی سرزمین سے نہیں بلکہ مغربی عرب سے ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

Kamal Salibi, *The Bible Came from Arabia* (London: Jonathan Cape, 1985).

کمال صلیبی نے پورے عبرانی متن سے اعراب ہٹا کر خود ہی اس پر اعراب لگانے کا کام کیا۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے بعض نہایت اہم عبارات کا بالکل ہی مختلف ترجمہ کیا۔ وہ کہتے ہیں:

> What I do is go all the way and read the Hebrew Bible in its unvocalized text, paying no regard to the Masoretic vocalization, in order to discover what sense I can make out of it by myself, before turning to find out what sense the Masoretes had made of it. I simply carry to its logical conclusion what scholars have been doing for nearly two centuries. In most cases my own reading of the Bible turns out to be no different from that of the Masoretes. In a number of cases, however, it does turn out to be radically different, and I explain in detail the reasons. (Kamal Salibi, *Secrets of the Bible People* (London: Saqi Books, 1988), pp 15-16.)

کمال صلیبی کے نظریات اور تحقیق پر مختلف حلقوں کی جانب سے مختلف وجوہات کی بنا پر سخت تنقید کی گئی۔ مثال کے طور پر دیکھیے:
A. F. L. Beeston, Review of *The Bible Came from Arabia*, Journal of the Royal Asiatic Society (1988), pp 389-93

بعض نے تو اسے ''اسرائیل کے اغوا'' سے بھی تعبیر کیا:

Tudor Parfitt, *The Hijacking of Israel*, The Sunday Times, 27 October 1985

تاہم حقیقت یہ ہے کہ صلیبی نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ مغربی محققین کے نظریات اور طریق کار کا منطقی نتیجہ ہے

فصل دوم:

تنقید عالی(Higher Criticism)

عبرانی متن پر کی جانے والی تنقید نے ''تنقید عالی'' کے لیے بنیاد فراہم کی۔[۲۳] اس تنقید عالی کے دو پہلو ہیں۔ ''تاریخی'' یا ''ادبی'' تنقید (Historical or Literary Criticism) اور ''نوعی'' یا ''روایتی'' تنقید (Form or Traditional Criticism)۔ تاریخی تنقید کے ماہرین یہ جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بائبل کے صحائف کب لکھے گئے ؟ کیا کوئی صحیفہ ایک ہی شخص کی تحریر ہے یا اسے مختلف ادوار میں مختلف اشخاص نے مرتب کیا ہے ؟ یہ شخص یا اشخاص کس قسم کے نظریات اور عقائد کے حامل تھے؟ اس صحیفے کی تحریر کے پیچھے مقاصد کیا تھے؟ یہ اور اس طرح کے دیگر سوالات قائم کرکے یہ ماہرین متن کا جائزہ لیتے ہیں اور تاریخ، آثار قدیمہ اور دیگر بیرونی مآخذ سے بھی مدد لیتے ہیں تاکہ متن کی تحریر کے وقت کے معروضی حالات کا بھی جائزہ لیا جائے اور متن کے پیغام کو بھی اس کے مخصوص تاریخی پس منظر میں سمجھا جائے۔ اس تاریخی تنقید نے یہ بات قطعی طور پر متعین کردی ہے کہ اسفار خمسہ ایک مصنف کی تحریر نہیں ہے، بلکہ اسے مختلف ادوار میں مختلف افراد نے مرتب کیا ہے، اور اسے آخری شکل ایک یا زائد ''مدونین'' (Redactors) نے دی۔ پہلے ایک ہی واقعے کے متعلق کئی روایات پائی جاتی تھیں، پھر ایک یا زائد مدونین نے ان روایات کو جمع کرکے ایک روایت کی شکل دینے کی کوشش کی اور بالآخر اسے موجودہ شکل دے دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان روایات میں بارہا اختلافات اور تضادات بھی سامنے آجاتے ہیں۔

روایتی تنقید (Traditional Criticism) اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ کہتی ہے کہ تحریری شکل میں آنے سے پہلے یہ مواد زبانی روایات پر مبنی تھا۔ چنانچہ ان زبانی روایات ہی سے مختلف مآخذ وجود میں آئے اور پھر رفتہ رفتہ یہ صحائف لکھے گئے۔ گویا یہ نظریہ پچھلے نظریے سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر زبانی روایات کے دور کی تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ''سماعی تورات'' (Oral Torah) کے ڈھونڈے جانے کا

۲۳- تفصیل کے لیے دیکھیے:

J., Coppens, *The Old Testament and the Critics*,(New Jersy: Guild Press, 1942); H. H., Rowley, *The Old Testament and Modern Study*,(Oxford: Clarendon Press, 1951)

عمل بھی جاری ہے۔ ان زبانی روایات میں بعض ابتدا میں تحریری شکل میں نہ آسکیں اور بدستور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ بعد میں ان میں بیشتر تلمود اور دیگر روایتی کتابوں میں جگہ پا گئیں۔بعض ماہرین نے یہ بھی دعویٰ کیاہے کہ بعض واقعات کے متعلق تحریری روایت زبانی روایت سے زیادہ قدیم ہے۔ اکثر ایک ہی واقعے کے متعلق کچھ زبانی روایات اور کچھ تحریری روایات پائی جاتی تھیں جن میں بعض مدونین نے کچھ ترک کیں اور کچھ لے کر ان میں اپنے طور پر تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً موجودہ اسفار خمسہ وجود میں آ گئے۔ اس عمل کی تکمیل میں کئی صدیاں بیت گئیں۔ اسفار خمسہ کے آخری شکل تک پہنچنے میں کتنا عرصہ لگا؟ اور یہ آخری شکل کب وجود میں آ گئی ؟اس قسم کے سوالات کے جواب پر تاریخی اور روایتی تنقید کے ماہرین کے درمیان کئی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ البتہ اتنی بات ان کی اکثریت کے نزدیک یقینی ہے کہ چوتھی صدی قبل از مسیح میں اسفار خمسہ موجودہ شکل میں پائے جاتے تھے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، اسفار خمسہ میں بسا اوقات ایک ہی واقعے کے متعلق دو یا تین روایات ان اسفار میں مذکور ہوتی ہیں جن کو بعض اوقات ملا کر ایک ہی روایت کی شکل دی گئی ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ روایات بالکل ہی الگ موجود ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر کتاب پیدائش میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں موجود جانوروں کی تعداد کے متعلق تین مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کو ہر جانور کا ایک ایک جوڑا لینے کا حکم دیا گیا۔[۲۴] دوسری روایت کے مطابق ان کو ''پاک جانوروں'' کے سات سات جوڑوں اور ''ناپاک جانوروں'' کے دو دو جوڑے لینے کا حکم ملا۔[۲۵] جبکہ تیسری روایت کے مطابق آپ نے بحکم خداوندی ہر پاک و ناپاک جانور کے دو دو جوڑے لیے۔[۲۶] اس اختلاف کی توجیہ یہ کی گئی کہ یہ ایک ہی واقعے کے متعلق تین مختلف مآخذ سے روایت لینے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

اسی طرح احکام عشرہ کا ذکر کم ازکم دو مقامات پر ملتا ہے۔[۲۷] سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے سیدنا ابراہیم

۲۴- پیدائش : باب ۶، آیت ۱۹

۲۵- پیدائش : باب ۷، آیت ۲-۳

۲۶- پیدائش : باب ۷، آیت ۸-۹

۲۷- دیکھیے : خروج: باب ۲۰ اور استثنا: باب ۵۔ کم از کم دو مزید مقامات پر احکام عشرہ کے متعلق روایت ملتی ہے: خروج باب ۳۴ اور احبار باب ۱۹۔ ان مقامات کے تقابلی جائزے اور تفصیلی تجزیے سے بہت دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں

علیہ السلام کے گھر سے نکلنے کا واقعہ بھی دو مقامات پر ہے۔[۲۸] یہی حال من و سلویٰ کے نزول کا ہے۔[۲۹] بیر سبع کی وجہ تسمیہ[۳۰] اور اسرائیل کی وجہ تسمیہ[۳۱] کے متعلق بھی دو دو روایات پائی جاتی ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا کو بہن قرار دے کر انھیں فرعون کے شر سے بچانے کی کوشش کے متعلق بھی دو روایات ہیں۔[۳۲] یہی واقعہ ایک اور روایت میں سیدنا اسحاق علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے۔[۳۳]

اس قسم کے اختلافات سے بڑھ کر وہ اختلافات ہیں جو عقائد اور الٰہیات کے متعلق ہیں۔ مثلاً بعض مقامات پر خدا کے متعلق بالکل ہی انسانوں کی مانند صفات ذکر کی گئی ہیں اور گویا تجسیم کا تصور پایا جاتا ہے، جبکہ بعض دوسرے مقامات پر تنزیہہ کا تصور انتہائی اعلیٰ سطح پر پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تجسیم کے متعلق کتاب خروج کا یہ بیان دیکھیے:

> ''تب موسیٰ اور ہارون اور ندب اور ابیہو اور بنی اسرائیل کے ستر بزرگ اوپر گئے۔ اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا جو آسمان کی مانند شفاف تھا اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا سو انہوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا اور پیا۔''[۳۴]

اب اس کے بالکل ہی برعکس کتاب خروج ہی کا بیان ملاحظہ ہو:

> ''اور یہ بھی کہا کہ تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا کیونکہ انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہے گا۔''[۳۵]

۲۸- پیدائش: باب ۱۶ اور باب ۲۱

۲۹- خروج: باب ۱۶ اور گنتی: باب ۱۱

۳۰- پیدائش: باب ۲۱ اور باب ۲۶

۳۱- پیدائش باب ۳۲ اور باب ۳۵

۳۲- پیدائش: باب ۱۲ اور باب ۲۰

۳۳- پیدائش: باب ۲۶

۳۴- خروج: باب ۲۴، آیت ۹ تا ۱۱

۳۵- خروج: باب ۳۳، آیت ۲۰

امام ابن حزم (۱۰۶۴ء) اور امام ابن تیمیہ (۱۳۲۸ء) سے لے کر علامہ رحمت اللہ کیرانوی (م ۱۸۹۱ء) اور جناب احمد دیدات (م ۲۰۰۵ء) تک بہت سے مسلمان محققین نے بھی ان اختلافات اور تضادات کی نشاندہی کی ہے، اور انہیں تورات میں تحریف کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔مسلمان اہل علم میں اس لحاظ سے سب سے جامع کام غالبًا علامہ رحمت اللہ کیرانوی کا ہے۔ انھوں نے ایک طرف تو اسفار خمسہ اور دیگر اسفار میں تضادات اور اختلافات کی بہت سی مثالیں جمع کیں۔ دوسری طرف اسفار خمسہ کے مختلف عبرانی، یونانی اور عربی تراجم میں موازنہ کرکے اختلاف روایت، الفاظ کی تبدیلی، الفاظ کے اضافے اورحذف الفاظ کے کئی شواہد نقل کیے۔ تیسری طرف اسفار خمسہ میں کئی تاریخی اور علمی غلطیاں واضح کرکے یہ ثابت کیا کہ یہ وحی پر مبنی نہیں ہیں اور چوتھی طرف اسفار خمسہ میں سیدنا موسی علیہ السلام کے زمانے کے بہت بعد کے واقعات اور اسما کی نشاندہی کرکے یہ ثابت کیا کہ موجودہ شکل میں اسفار خمسہ کو سیدنا موسی علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا قطعاً غلط ہے۔ تاہم علامہ کیرانوی کے بعد آنے والے مسلمان اہل علم نے بالعموم پرانی لکیر پیٹنے کو ہی ترجیح دی، الا ما شاء اللہ۔ چاہیے یہ تھا کہ انھوں نے جو بنیاد فراہم کی اس پر مسلمان اہل علم بائبل پر تنقید کی عمارت تعمیر کرتے اور اس سلسلے میں باقاعدہ کوئی نظریہ پیش کرتے۔

دستاویزی نظریے کی تشکیل

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغربی محققین نے اسفار خمسہ میں موجود مختلف روایات کو الگ کرنے کے کام کی طرف بھر پور توجہ دی۔ غالبًا اس کام کی بنیاد جرمن عالم ایچ بی وِٹر نے رکھی جب انھوں نے ۱۷۱۱ء میں دعویٰ کیا کہ سِفر پیدائش میں تخلیق کائنات اورتخلیق انسان کی روایت درحقیقت دو مختلف روایات کو ملا کر بنائی گئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک روایت پہلے باب کی پہلی آیت سے دوسرے باب کی چوتھی آیت کے پہلے جز تک ہے۔ جبکہ دوسری روایت اس آیت کے دوسرے جز سے تیسرے باب کی چوبیسویں آیت تک ہے۔ ان روایات کی نشاندہی اس امر نے کی کہ ان میں خدا کے لیے الگ نام استعمال کیے گئے تھے۔ ایک روایت میں اسے ہر جگہ ''یہوہ'' کے نام سے اور دوسری روایت میں ہر جگہ ''الوہیم'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ۱۷۵۳ء میں فرانسیسی طبیب جین آسٹرک بھی اپنی آزادانہ تحقیق کے بعداسی نتیجے پر پہنچا۔ آسٹرک نے دعویٰ کیا کہ خدا کے ان ناموں کی بنیاد پر پوری سِفر پیدائش کو دو روایات ۔''یہوی'' اور''الوہی'' ۔ پر مبنی دکھایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد سے سِفر پیدائش کے دو مآخذ پر مزید تحقیق کی جانے لگی۔ ۱۷۸۰ء میں جے جی

اکہارن نے سفر پیدائش میں ایک ہی واقعے کے متعلق ایک سے زائد روایات اور الفاظ اور اسالیب کے تنوع کو بھی دلیل کے طور پر استعمال کیا جس کے نتیجے میں دو مآخذ کی پہچان اور بھی آسان ہوگئی۔ ۱۷۹۸ء میں کے ڈی الگن نے ''الوہی ماخذ'' کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا اور قرار دیا کہ سِفر پیدائش کی تشکیل میں تین روایات یا مآخذ سے مدد لی گئی ہے۔

۱۸۰۵ء میں ڈے ویٹ نے دعویٰ کیا کہ سِفر استثنا ہی دراصل وہ کتاب ہے جو ساتویں قبل از مسیح میں یوسیاہ کے عہد میں یروشلم کے ہیکل میں ملی تھی جس کے بعد یوسیاہ نے بنی اسرائیل میں اصلاحی مہم شروع کی تھی۔ [۳۶] اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ استثنا میں بہت سے ایسے قوانین ہیں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ استثنا ساتویں صدی قبل از مسیح ہی میں لکھی گئی تھی۔

۱۸۵۳ء میں ہرمین ہپفیلد نے دستاویزی نظریے کو اسفار خمسہ کے دیگر حصوں پر بھی منطبق کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ پہلی چار کتابیں ۔ پیدائش، خروج، احبار اور گنتی ۔ تین مآخذ سے لی گئی ہیں :

۱- یہوی ماخذ (J) جو خدا کو ''یہوہ'' کے نام سے ذکر کرتا ہے؛
۲- الوہی ماخذ (E) جو خدا کو ''الوہیم'' کے نام سے یاد کرتا ہے ؛ اور
۳- ایک اور الوہی ماخذ جو خدا کو ''الوہیم'' ہی کے نام سے یاد کرتا ہے لیکن اس میں مذہبی رسومات اور لوگوں کے شجرہائے نسب کے متعلق زیادہ معلومات ہوتی ہیں اس لیے اسے Priestly یا مختصراً P کہا گیا۔

پانچویں کتاب۔استثنا۔ کے متعلق کہا گیا کہ یہ اسلوب بیان، ذخیرۂ الفاظ، قوانین اور تصورات سب کچھ میں باقی چار کتابوں سے مختلف ہے۔ اس لیے قرار دیا گیا کہ یہ ایک بالکل ہی الگ ماخذ سے لی گئی ہے جسے Deuteronomic یا D کہا گیا۔[۳۷]

انیسویں صدی کے اواخر میں دو جرمن محققین کارل ایچ گراف اور جولیس ولہاسن نے ان ابتدائی تحقیقات پر مزید اضافہ کرکے ان مآخذ کے انضمام سے وجود میں آنے والی دستاویزات کے لیے تاریخیں بھی

۳۶- دیکھیے : ۲۔ سلاطین : باب ۲۲

۳۷- یہ ساری تفصیل جیمز کنگ ویسٹ سے اخذ کی گئی ہے دیکھیے :

Introduction to the Old Testament, pp 37-38

متعین کر دیں۔[۳۸] اس سلسلے میں انھوں نے بنیادی طور پر ڈے ویٹ کی تحقیق پر انحصار کیا۔ گراف اور ولہاسن کا خیال تھا کہ استثنا کا مصنف روایت J اور روایت E سے واقف تھا لیکن وہ روایت P سے واقف نہیں تھا۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روایت P تاریخی لحاظ سے روایت D کے بعد ہے۔ اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ J اور E میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی کہ قربان گاہ ایک ہی ہونی چاہیے[۳۹] جبکہ D میں ایک ہی قربان گاہ کا حکم ہے۔[۴۰] اور P میں احکامات کے پیچھے مفروضہ یہی کارفرما نظر آتا ہے کہ قربان گاہ ایک ہی ہے۔ اسی طرح J اور E میں قربانی دینے والوں کے لیے نسل کی کوئی قید نہیں ہے، جبکہ D میں مذکور ہے کہ یہ کام بنی لاوی کا ہے، اور P میں اسے مزید مخصوص کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ بنی لاوی میں سیدنا ہارون علیہ السلام کی نسل کے کاہن ہی قربانی گزرانیں گے۔

یہاں ان مآخذ کی مختصر وضاحت پیش کی جاتی ہے :

پہلا ماخذ: یہوی (Yahwist/Jehovist)

اسفارِ خمسہ میں خدا کے لیے بہت سے مقامات پر مسلسل اسم ذات ''یہوہ'' (Yahweh) استعمال ہوا ہے جسے اردو تراجم میں ''خداوند'' اور انگریزی تراجم میں Lord کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان محققین کے خیال کے مطابق یہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ جہاں خدا کے لیے استعمال ہوا ہے وہاں خدا انسانوں سے مشابہ نظر آتا ہے، گویا تجسیم کی آیات میں بالعموم یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ اس قسم کی آیات بنی اسرائیل کے ابتدائی مذہب کی عکاس ہیں جب ابھی توحید اور تنزیہہ کا تصور ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ان آیات کے مفروضہ ماخذ کو ''یہوی ماخذ'' (Yahwist Source) کہا جاتا ہے جسے مختصراً J سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ جرمن زبان میں یہوہ کا تلفظ ''جیہوہ'' (Jehovah) کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی آیات میں اسلوب انتہائی ڈرامائی قسم کا ہوتا ہے۔ اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ اس ماخذ کی آیات میں جناب یہوداہ کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی جناب یہوداہ نے بچایا تھا۔[۴۱] جناب یہوداہ کی اولاد بنی اسرائیل کی سلطنت کی تقسیم کے بعد جنوبی حصے پر

۳۸- تفصیل کے لیے دیکھیے: Julius Wellhausen, *Prolegomena to the History of Ancient Israel*, (Clevland: The World Publishing Company, 1957)

۳۹- مثلاً دیکھیے: خروج : باب ۲۰ آیات ۲۴-۲۵

۴۰- استثنا : باب ۱۲

۴۱- پیدائش : باب ۳۷، آیات ۲۶-۲۷

حکمران رہی۔ اس ماخذ کی آیات میں جنوبی سلطنت سے متعلق مقامات، قربان گاہوں اور شخصیات کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ماخذ کے راویوں کا تعلق جنوبی سلطنت سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیدائش، خروج اور گنتی کے اسفار میں بنیادی کہانی کار کی حیثیت J ہی کو حاصل ہے اور اس روایت پر پھر E اور P کے اضافے ہوئے ہیں۔

گراف اور ولہاسن کے نزدیک یہ روایت نویں صدی قبل از مسیح (تقریباً ۸۵۰ ق م) سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسرا ماخذ: الوہی (Elohist)

ان صحائف میں اکثر مقامات پر خدا کے لیے اسم ذات کے بجائے صفاتی نام ''الوہیم'' (Elohim) استعمال کیا گیا ہے۔ اور ایسے مقامات پر تنزیہہ کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس لیے مفروضہ یہ ہے کہ یہ آیات ایک بعد کے زمانے کے ماخذ سے حاصل کی گئی ہیں جب بنی اسرائیل کے مذہب نے کافی ترقی کرلی تھی اور تجسیم سے تنزیہہ تک کا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اس ماخذ کو مختصراً E سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بعض اوقات J کے ساتھ اس حد تک ضم ہوا ہوتا ہے کہ ان کا الگ کرنا بہت زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔ اس لیے ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں اصلاً ایک ہی زبانی روایت پر مبنی تھے۔

E سے منسوب آیات میں یہ پہلو بھی واضح نظر آتا ہے کہ ان میں بزرگ شخصیات کے افعال کی اخلاقی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ ایک ہی واقعہ اگر J اور E دونوں میں روایت ہو تو اول الذکر روایت اخلاقیات سے لاتعلق (Indifferent) ہوگی اور ثانی الذکر روایت میں وہ واقعہ یوں بیان ہوا ہوگا کہ اس پر اخلاقی پہلو سے کوئی اعتراض نہ ہوسکے۔ مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق دو جگہ روایت کیا گیا ہے کہ انھوں سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا کو اپنی بہن قرار دیا تھا۔[۴۲] ایک روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ رشتے میں ان کی بہن لگتی تھی[۴۳]، گویا انھوں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔اس روایت کو E سے منسوب کیا جاتا ہے اور جو روایت اس سلسلے میں خاموش ہے اسے J سے منسوب کیا جاتا ہے۔

۴۲- پیدائش : باب ۱۲، آیت ۱۳

۴۳- پیدائش : باب ۲۰، آیت ۱۲۔ حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے : أبوعبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ : و اتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً

E سے منسوب آیات کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان میں بنی اسرائیل کی شمالی سلطنت کی شخصیات کا تذکرہ غالب ہوتا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی جناب روبن نے بچایا تھا۔[۴۴] نیز سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعے سے متعلق اکثر آیات کو اس ماخذ سے منسوب کیاجاتا ہے۔ اس بنیاد پر کہاجاتا ہے کہ اس روایت کا تعلق شمالی سلطنت سے تھا کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی اولاد (منسی اور افرائیم کے قبائل) اور جناب روبن کی اولاد شمالی سلطنت میں آباد تھی۔ ایک اور دلیل اس سلسلے میں یہ دی جاتی ہے کہ شمالی سلطنت کے مقامات مثلاً بیت ایل اور سکم کا تذکرہ بھی ان آیات میں بکثرت ملتا ہے۔

سِفر پیدائش کے ابتدائی گیارہ ابواب کی آیات کو E کی طرف نسبت نہیں دی جاتی۔ البتہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعات سے E کی آیات کا عمل دخل شروع ہوجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنیادی روایت J کی ہوتی ہے اور E اس پر اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اس لیے کسی بھی واقعے میں تنہا E کی روایت ملنی مشکل ہوتی ہے۔ البتہ ذبیح کے واقعے[۴۵] کو بنیادی طور پر E ہی کی روایت مانا جاتا ہے۔ اس روایت کی تاریخ کے متعلق گراف اور ولہاسن کا اندازہ ۷۰۰ ق م کا تھا۔

تیسرا ماخذ: تثنیہ شرع (Deuteronomic)

کتاب استثناء کا اسلوب، ذخیرۂ الفاظ، احکام شرع کے بیان کا طرز، غرض سبھی کچھ باقی چار کتابوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ایک بالکل ہی الگ ماخذ سے لی گئی ہے جسے Deuteronomic کہاجاتا ہے اور مختصراً اسے D سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اسلوب بائبل کے بعض دیگر صحائف، بالخصوص اسفار انبیائے سابقین، میں بھی نظر آتا ہے جو J اور E سے نسبتاً متاخر دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ D ماخذ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت بعد کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ گراف اور ولہاسن نے اس روایت کی تاریخ کے لیے ۶۵۰ ق م کا اندازہ لگایا۔

''سن اے اسرائیل''، ''اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان''، ''تاکہ تیری عمر دراز ہو'' اور اس جیسے دوسرے جملے اور تراکیب صرف سِفر استثنا میں ہی ملتے ہیں۔ یہ صحیفہ یہ درس بھی انتہائی تاکید سے دیتا ہے کہ

۴۴- پیدائش باب ۳۷، آیات ۲۱-۲۲

۴۵- پیدائش: باب ۲۲، آیات ۱-۱۹

شریعت پر عمل کے اچھے نتائج اور شریعت سے روگردانی کے برے نتائج دنیا میں ہی یقینی اور قطعی طور پر ملتے ہیں۔ اسی طرح J اور E سے منسوب آیات کے برعکس سِفر استثنا کا پیغام یہ ہے کہ قربان گاہ ایک ہی ہو جو مرکزی عبادت گاہ میں ہو۔

کہا جاتا ہے کہ جنوبی سلطنت میں بادشاہ یوسیاہ نے ۶۲۲ ق م میں بنی اسرائیل میں اصلاح کی آخری کوشش شروع کی تو اس کا انحصار اسی صحیفے پر تھا اور یہی وہ کتاب تھی جو ہیکل کی صفائی کے دوران ملی تھی۔ (۴۶) دستاویزی نظریے کے قائلین کا کہنا ہے کہ یہ صحیفہ اس سے کچھ عرصہ پہلے شمالی سلطنت میں لکھا گیا تھا اور وہاں مشہور ہو چکا تھا جس کے بعد اس نے جنوبی سلطنت میں بھی قبول عام حاصل کرلیا۔ تب گویا JED کی صورت وجود میں آگئی۔ (۴۷)

چوتھا ماخذ: فقہی (Priestly)

ان صحائف میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں عبادات، قربانیوں، کفارات، نذور، مواثیق، پاکی و ناپاکی کے مسائل اور اس طرح کی دیگر تفصیلات اور فقہی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح بعض مقامات پر لوگوں کے لمبے لمبے شجرہائے نسب بیان ہوئے ہیں یا عمروں کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ اس طرح کے موضوعات کو ایک خاص طرح کے "خشک" اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اضافے کاہنوں اور احبار نے کیے ہیں اور اس مناسبت سے ان آیات کے ماخذ کو Priestly کہا جاتا ہے جسے مختصراً P سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں تنزیہہ کا تصور بالکل انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

اسفار خروج، احبار اور گنتی میں قربانیوں سے متعلق احکام، کفارات، پاکی و ناپاکی اور اس طرح کے دیگر مسائل سے متعلق احکام کو P سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن سِفر پیدائش میں سیدنا نوح علیہ السلام، سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا یعقوب علیہ السلام کی قربانیوں کے متعلق آیات کو P سے منسوب نہیں کیا جاتا کیونکہ مفروضہ یہ ہے کہ D کی طرح P کے نزدیک قربانی صرف ایک مرکزی قربان گاہ پر ہونی چاہیے۔ اسی طرح فرض کیا گیا ہے کہ P کے نزدیک قربانیوں کے احکام سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے قبل نہیں دیے گئے تھے۔

گراف اور ولہاسن کے اندازے کے مطابق یہ ماخذ ۵۰۰ اور ۴۵۰ ق م کے درمیانی عرصے میں وجود

۴۶- ۲-سلاطین : باب ۲۲

۴۷- *Introduction to the Old Testament*, P 44

میں آیا۔

اسفارِ خمسہ کی آیات کے ان مآخذ کی طرف نسبت میں اس نظریے کے قائلین کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تاہم عام طور پر ذیل کی تقسیم کو متفق علیہ سمجھا جاتا ہے :

سِفر پیدائش ابواب ۱ تا ۱۱ P اور J سے لیے گئے ہیں۔

سِفر پیدائش ابواب ۱۲ تا سِفر خروج باب ۳۴ P، J اور E سے لیے گئے ہیں۔

سفر خروج باب ۳۵ تا اختتام، پورا سِفر احبار اور سِفر گنتی باب ۱۰ کے پہلے حصے تک صرف P سے لیے گئے ہیں۔

سِفر گنتی باب ۱۰ کے دوسرے حصے سے اختتام تک پھر تین مآخذ P، J اور E سے لیے گئے ہیں۔

سِفر استثنا پورا کا پورا D سے لیا گیا ہے۔ (۴۸)

گویا تین صحائف۔ پیدائش، خروج اور گنتی۔ کے متعلق مفروضہ یہ ہے کہ ان میں تین مآخذ ۔ J, E,P۔ سے مواد لیا گیا ہے اور جگہ جگہ مدونین نے لیپا پوتی بھی کی ہے۔ مدونین کے (Redactors) اضافہ کردہ الفاظ اور جملوں کو مختصراً R سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کتاب احبار میں مدونین کی کارفرمائی سے قطع نظر کیا جائے تو وہ بنیادی طور پر ایک ہی ماخذ P سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح کتاب استثناء بھی بنیادی طور پر ایک ہی ماخذ D سے ماخوذ ہے۔

ولہاسن کے مطابق ان مآخذ کے آپس میں انضمام اور اس کے نتیجے میں اسفارِ خمسہ کی تدوین کا کام تین مراحل میں مکمل ہوا۔ ان کے خیال کے مطابق D کے راوی کو J اور E اس صورت میں ملے کہ وہ باہم جڑے ہوئے تھے۔ گویا D سے پہلے (۶۵۰ ق م سے پہلے) JE صورت وجود میں آچکی تھی۔ پھر مدون /مدونین نے ۵۵۰ ق م کے لگ بھگ D بھی اس کے ساتھ ضم کردی اور یوں JED کی صورت بن گئی۔ اس کے بعد ۴۰۰ ق م کے لگ بھگ اس کے ساتھ P کی روایت بھی ملحق کی گئی اور نتیجتاً (سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً ایک ہزار سال بعد) JEDP یا موجودہ اسفارِ خمسہ وجود میں آگئے۔

ولہاسن کے بعد اس نظریے میں کئی بنیادی تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ جن میں غالباً سب سے اہم یہ ہے کہ اب یہ مفروضہ ترک کردیا گیا ہے کہ یہ مآخذ کسی ''دستاویز'' کی صورت میں کسی ایک مصنف نے کسی ایک

۴۸- ایضاً، ص ۳۹۔ دیگر اسفار میں D سے چند ہی آیات منسوب کی جاتی ہیں مثلاً: پیدائش : باب ۱۵، آیات ۱۳۔۱۶؛ خروج : باب ۱۲، آیات ۲۴۔۲۷؛ باب ۱۳، آیات ۱۔ ۱۶؛ باب ۳۲، آیات ۷۔۱۴

موقع پر تحریر کیے۔ بلکہ اب مفروضہ یہ ہے کہ کافی عرصے میں زبانی اور تحریری روایتوں نے بتدریج ایک ماخذ کی تشکیل کی اور اس کے ساتھ متوازی دوسرے ماخذ کی تشکیل کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ پھر دو کے انضمام کا مرحلہ بھی بتدریج طے ہوتا اور ساتھ ہی تیسرے اور چوتھے مآخذ کی تشکیل اور انضمام کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہتا۔ گویا ہر ماخذ میں کچھ مواد نہایت قدیم ہے جو اصلاً زبانی روایت کی صورت میں ہی نقل ہوا تھا۔ پس ہوسکتا ہے کہ D اور P کا کچھ حصہ E اور J سے زیادہ قدیم ہو۔ ولہاسن کی ذکر کردہ تواریخ کو صرف اس لحاظ سے کارآمد سمجھا جاتا ہے کہ ان سے ہر ماخذ کی آخری شکل تک پہنچنے کے دور کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ بعض محققین نے J کی تاریخ کو ایک صدی مزید پیچھے دھکیل کر ۹۵۰ ق م کردیا ہے۔(۴۹)

اسفار خمسہ کی تشکیل و تدوین کے متعلق اس دستاویزی نظریے پر بہت تنقید بھی کی گئی ہے اور اس کی مزید اصلاح بھی کی جاتی رہی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر اس نظریے کو قابل قبول سمجھا جاتا ہے اور اسفار خمسہ پر تحقیق و تنقید کے سلسلے میں اسے نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔

فصل سوم: ان نظریات کی کمزوریاں

بائبل کے مآخذ اور تاریخی تدوین کے مراحل پر مغربی محققین کی یہ کوششیں یقیناً قابل قدر ہیں اور مسلمان محققین کو ان سے استفادہ بھی کرنا چاہیے۔ تاہم اس سلسلے میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان محققین کے بنیادی مفروضات انتہائی غلط ہیں۔ ان کا لادینی نقطۂ نظر، وحی الٰہی پر عدم ایمان اور اسباب و علل کے متعلق

۴۹- اس نظریے کو بائبل کے دیگر صحائف پر بھی منطبق کیا گیا اور یوں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ سفر یوشع بھی دراصل اسفار خمسہ ہی کا حصہ ہے۔ اس کے بعد ''اسفار ستہ'' (Hexateuch) کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔ بعض محققین نے اس نظریے سفر سموئیل تک وسعت دے کر ''اسفار ثمانیہ'' (Octateuch) کی اصطلاح وضع کرلی اور بعض نے اسے اور بھی وسعت دے کر سفر سلاطین بھی اس میں شامل کرلیا اور یوں ''اسفار تسعہ'' (Enneateuch) کی اصطلاح بھی استعمال ہونے لگی۔ ایک اور محقق نے دعویٰ کیا کہ سفر استثنا کا تعلق تورات سے نہیں بلکہ اسفار انبیائے سابقین سے ہے۔ چنانچہ اس نے تورات کے لیے ''اسفار اربعہ'' (Tetrateuch) اور استثنا اور اسفار انبیائے سابقین کے لیے ''استثنائی تاریخ'' (Deuteronomic History) کی اصطلاح وضع کرلی۔ اس دلچسپ نظریے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

Joseph Carpenter, Harford-Bettersby, The Hexateuch According to the Revised Version, (New York: Longman, 1900)

Gerhard von Rad, *The Problem of the Hexateuch and Other Essays*,(New York: McGraw-Hill, 1966)

ان کے مخصوص نظریات نتائج تک پہنچنے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ یہ نظریات اس مفروضے پر قائم ہیں کہ بنی اسرائیل کے دین نے بتدریج ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے تجسیم سے گزر کر تنزیہہ کی منزل حاصل کی ہے۔ اسی طرح ان نظریات کے پیچھے وحی کے انکار کا مفروضہ کارفرما ہے۔ یہاں ان نظریات کے کمزور پہلوؤں کی مختصر وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔

اولاً: وحی الٰہی سے انکار

ان نظریات کی بنیاد وحی الٰہی سے انکار پر ہے۔ یہ ناقدین مفروضات قائم کرتے ہوئے صرف انسانی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو دیکھتے ہیں اور وحی الٰہی کی روشنی کو قطعی طور پر نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان کا بنیادی نقطۂ نظر لادینی ہے۔ چنانچہ ایک جانب وہ قربانیوں سے متعلق احکام کو نسبتاً بعد کے دور سے متعلق سمجھ کر انہیں P کا حصہ سمجھتے ہیں اور دوسری طرف سیدنا نوح، سیدنا ابراہیم اور سیدنا یعقوب علیہم السلام کی قربانیوں سے متعلق احکام کو وہ P سے منسوب نہیں کرتے۔ اس کی وجہ وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ P میں مذکور قربانی کے احکام صرف مرکزی قربان گاہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح سِفر خروج میں قربانی کے احکام کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ان میں مرکزی قربان گاہ کی شرط نہیں رکھی گئی اس لیے یہ ایک الگ ماخذ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس توحید خالص اور وحی پر ایمان رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ہر رسول کا دین درحقیقت ایک ہی ہے، البتہ جزئیات اور تفصیلی احکامِ شریعت میں زمان و مکان کے لحاظ سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ پس ایک سادہ توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے دور میں اللہ تعالیٰ کے لیے قربانیاں دیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ ابتدا میں جبکہ بنی اسرائیل صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کررہے تھے ان کو یہ حکم نہیں دیا جاسکتا تھا کہ وہ ایک مرکزی قربان گاہ میں ہی قربانی ادا کریں، نہ ہی ان کو یہ حکم دیا جاسکتا تھا کہ یہ کام سرانجام دینے کی ذمہ داری صرف ایک مخصوص قبیلے کو ہی سونپ دی جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارکہ کے دورآخر میں جب بنی اسرائیل کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص سانچے میں ڈھل چکی تھی تو انھیں آئندہ کے لیے احکام دیے گئے کہ جب وہ اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا دین غالب کردیں گے اور مشرکین کا صفایا کردیں گے تو پھر ان کی ایک مرکزی عبادت گاہ ہوگی جس کی طرف مختلف چھوٹی چھوٹی عبادت گاہوں کا رخ ہوا کرے گا۔ یوں یہ مرکزی عبادت گاہ ان کے لیے قبلے کی حیثیت اختیار کرلے گی۔

اس قسم کی مرکزیت اتحاد اور یکجہتی کے لیے اشد ضروری ہوتی ہے اور قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ اس مرکزیت کی ایک ابتدائی صورت بنی اسرائیل میں اس دور میں بھی قائم کی گئی تھی جب وہ مصر میں تھے:

﴿ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰی وَ اَخِیۡہِ اَنۡ تَبَوَّاٰ لِقَوۡمِکُمَا بِمِصۡرَ بُیُوۡتًا وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ [سورۃ یونس: ۸۷]

(اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرالو، اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ، اور نماز کا اہتمام کرو، اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دو۔)

صحرا نوردی کے دور میں یہی حیثیت خیمۂ اجتماع نے حاصل کرلی اور سرزمین فلسطین کی فتح کے بعد یہ حیثیت بیت المقدس کو حاصل ہوگئی۔ قرآن مجید اور بائبل دونوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیمۂ اجتماع اور بیت المقدس دونوں کا رخ در اصل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے مرکز ۔ خانۂ کعبہ ۔ کی طرف تھا اور یوں بنی اسرائیل کی یہ امت مسلمہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قائم کردہ عالمی امت مسلمہ کے ساتھ منسلک تھی۔ [۵۰]

ثانیاً: مذہب کا شرک سے توحید کی طرف ارتقا

جیسا کہ واضح کیا گیا یہ نظریات اس مفروضے پر قائم ہیں کہ بنی اسرائیل کے دین نے بتدریج ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے تجسیم سے گزر کر تنزیہہ کی منزل حاصل کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ جن بنیادوں پر قائم ہے وہ اتنی مضبوط نہیں ہیں۔ مثلاً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ جن آیات میں خدا کے لیے ''یہوہ'' کا لفظ آیا ہے وہ تجسیم پر مشتمل ہیں اور جن آیات میں خدا کے لیے ''الوہیم'' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ تنزیہہ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ذیل کی آیات میں ''یہوہ'' کا لفظ آیا ہے مگر ان میں تجسیم کا نشان بھی نہیں ہے :

''اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا، اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعث برکت ہوا۔ جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں

۵۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: حمید الدین فراہی، الرأی الصحیح فی من هو الذبیح، اردو ترجمہ: ذبیح کون ہے؟ (لاہور: انجمن خدام القرآن، ۱۹۷۶ء)۔ مترجم: مولانا امین احسن اصلاحی

برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے ان پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔''(۵۱)

اسی طرح ذیل کی آیات میں ''الوہیم'' کا لفظ آیا ہے مگر ان سے تنزیہہ کے بجائے تجسیم کا تصوراخذ کیا جاتا ہے :

''جب روئے زمین پر آدمی بہت بڑھنے لگے اور ان کے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئیں، تو خدا کے بیٹوں نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ خوبصورت ہیں اور جن کو انہوں نے چنا اور ان سے بیاہ کرلیا۔''(۵۲)

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے یـد، یمین، وجه وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں، لیکن ساتھ ہی قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کا واشگاف اعلان کرتا ہے۔ یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے کہ ان دوقسم کی آیات میں کوئی تعارض پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہی دیکھئے کہ صفات کا اثبات اورتنزیہہ دونوں ایک ہی جملے میں کیسے کیے جاتے ہیں :

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾[سورہ الشوریٰ: ١١]

(اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے، اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

اسی طرح یہ اصول کہ تشبیہ وتجسیم کی آیات تنزیہہ کی آیات کی بہ نسبت پرانے دور سے تعلق رکھتی ہیں اس غلط مفروضے پر قائم کیا گیا ہے کہ مذہب نے شرک سے توحید اورتشبیہ وتجسیم سے تنزیہہ تک بتدریج ارتقا کے منازل طے کیے ہیں۔(۵۳)

ثالثاً: معجزات اور پیش گوئیاں

پچھلے ڈھائی سو سالوں میں مغربی محققین نے اسفارخمسہ پر بڑی اچھی تحقیق کی ہے۔ تاہم ان تحقیقات

۵۱- پیدائش : باب۱۲، آیات ۱-۳

۵۲- پیدائش : باب ۶، آیات ۱-۲

۵۳- اس نظریے پرقرآن مجید کی روشنی میں تفصیلی تنقید کے لیے دیکھیے: مولانا امین احسن اصلاحی، حقیقت شرک وتوحید (لاہور: فاران فاؤنڈیشن،)،ص ۸۸-۱۰۲

میں ان کے مخصوص نظریات وتعصّبات کی کارفرمائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ محققین اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے کسی طور تیار نہیں ہوتے کہ کئی سو سال بعد پیش آنے والے واقعات کے متعلق اللہ کا کوئی نبی وحی کی بنا پر بالکل صحیح پیش گوئی کرسکتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ وحی کے متعلق شک کا شکار ہوتے ہیں اور ہر معاملے کو سبب اور مسبب کے قوانین (Laws of Cause and Effect) ہی کی روشنی میں دیکھتے ہیں اس لیے اس قسم کی پیش گوئیاں انھیں ناممکن لگتی ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی پیش گوئیوں کے متعلق وہ یا تو یہ کہتے ہیں کہ یہ واقعے سے کچھ ہی قبل آثار و قرائن دیکھ کر کی گئیں، یا یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ دراصل پیش گوئی نہیں بلکہ یہ باتیں تو واقعہ ہوچکنے کے بعد کسی نے پیش گوئی کے اسلوب میں لکھ کر کتاب مقدس میں داخل کردیں۔

تورات سے اس کی مثال یہ ہے کہ کتاب استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو انذار وتبشیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی دل و جان سے پیروی کریں گے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نازل ہوں گی، اور اگر وہ ان سے منہ موڑیں گے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے :

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ٥ وَ قَالَ مُوْسٰى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ [سورہ ابراہیم: ۷-۸]

(اور یاد کرو جب تمھارے رب نے تمہیں آگاہ کردیا کہ اگر تم شکر گزار رہوگے تو میں تمھیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سارے لوگ جو روئے زمین پر ہیں ناشکری کروگے تو (اللہ کا کچھ نہیں بگاڑوگے کیونکہ) اللہ بے نیاز اورستودہ صفات ہے۔)

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [سورہ الاعراف: ۱۶۷]

(اور یاد کرو جب تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ وہ روز قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت برے عذاب چکھاتے رہیں گے۔ بے شک تیرا رب جلد پاداش دینے والا ہے، اور بے شک وہ بخشنے

والا مہربان ہے۔)

﴿وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾[بنی اسرائیل:۴]

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلے سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔)

مگر مغربی محققین اس قسم کی تفصیلات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بابل جلاوطنی (۵۸۷ ق م) سے کچھ قبل یا اس کے بعد کسی نے لکھ کر صحائف میں داخل کر دی ہیں۔ پھر اسی سے وہ کتاب استثناء کی تاریخ تصنیف معلوم کرتے ہیں اور مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں گویا 'ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھاتے ہیں۔' انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کہتے ہیں :

"Chapter 30 verses 1-10 seem clearly to be an explanation inspired by the actual experience of exile." (54)

تاہم وحی الٰہی اور نبوت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اس معاملے میں شک کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

رابعاً: اخلاقی توجیہات کا انکار

P کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ J اور E سے نسبتاً متأخر دور سے تعلق رکھتا ہے اور یہ کہ اس ماخذ کی آیات احبار و فقہا کی اضافہ کردہ ہیں۔ اس ماخذ میں وہ آیات بھی شمار کی جاتی ہیں جن میں انبیاء اور دیگر بزرگوں کے افعال کی اخلاقی توجیہ کی گئی ہے۔ مثلاً اگر کسی آیت میں کسی بزرگ کی طرف کوئی برائی منسوب کی گئی ہے اور کسی دوسری آیت میں اس بات کی نفی کی گئی ہے تو یہ محققین فوراً ہی سابق الذکر کو J اور مؤخر الذکر کو P سے منسوب کر دیں گے، کیونکہ ان کے نزدیک J، جسے قدیم ماخذ سمجھا جاتا ہے، کے متعلق مفروضہ یہ ہے کہ اس کو اخلاقیات سے کوئی سروکار نہیں تھا، جبکہ P کے متعلق، جسے نسبتاً بعد کے دور کا سمجھا جاتا ہے، فرض کیا گیا ہے کہ وہ اخلاقیات کے متعلق بہت حساس تھا۔

اگر اسلامی علوم کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مفروضہ بھی سرے سے ناقابل قبول ہے۔ قرآن و حدیث

۵۴- *Encyclopedia Britannica*, Vol. 14, P 781

نے تمام انبیاء علیہم السلام کی ہر قسم کے گناہوں سے عصمت کا تصور دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے وہ آیات ناقابل قبول ہیں جن میں انبیاء علیہم السلام کی طرف کسی اخلاقی برائی کی نسبت کی گئی ہے، اور وہ ہمارے نزدیک بعد میں اضافہ کردہ آیات ہیں، نہ کہ قدیم ترین ماخذ پر مبنی آیات۔

خامساً: غلط بنیادیں

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظریے کی کئی بنیادیں انتہائی حد تک غلط ہیں۔ مثلاً J اور E کی آیات کی پہچان کے لیے ایک بنیاد یہ مقرر کی گئی ہے کہ کیا آیت میں شمالی سلطنت کی شخصیات کو فوقیت دی گئی ہے یا جنوبی سلطنت کے لوگوں کو؟ سلطنت کی تقسیم سے پہلے یہ قبائل اکٹھے رہ رہے تھے اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اسفار خمسہ کی روایات میں بڑا حصہ اسی مشترکہ ورثے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہی بات روایتی تنقید کے حاملین بھی کہتے ہیں کہ تحریری شکل میں آنے سے پہلے اسفار خمسہ کی بہت سی روایات در اصل سینہ در سینہ منتقل ہونے والی زبانی روایات کی شکل میں تھیں۔ ایسے میں محض شمالی یا جنوبی مقامات و شخصیات کے ذکر کو بنیاد بنا کر آیات میں تفریق کرنا نہایت نامناسب لگتا ہے۔ نیز ان مزعومہ مآخذ کی مندرجہ ذیل خصوصیات پر غور کیجیے:

یہوی ماخذ (J)

۱- یہ جنوبی سلطنت کی روایت ہے۔

۲- یہ اسفار خمسہ میں اصل راوی ہے۔ E اور P نے تو اس روایت میں کہیں کہیں کچھ باتیں اضافہ کی ہیں۔

۳- یہ نویں صدی قبل از مسیح (۸۵۰ یا ۹۵۰ ق م) میں تحریری شکل میں آچکا تھا۔

الوہی ماخذ (E)

۱- یہ شمالی سلطنت کی روایت ہے۔

۲- ذبیح کے واقعے کے ماسوا کوئی بھی مکمل کہانی اس ماخذ سے منسوب نہیں ہے۔ اس کی حیثیت جگہ جگہ J پر اضافے کی سی ہے۔

۳- یہ ۷۰۰ ق م میں تحریری شکل میں آچکا تھا۔ گویا E کے لکھے جانے سے بہت پہلے J لکھا جاچکا تھا۔ E

کے راوی نے جگہ جگہ J پر اضافے کیے، یا اس کی تصحیح کی۔ ان دونوں کے انضمام کے بعد JE کی شکل تقریباً ۶۵۰ ق م میں سامنے آگئی۔

یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی سلطنت میں اپنے بزرگوں کے متعلق روایت نے تحریری شکل اختیار کرنے میں اتنا زیادہ عرصہ کیوں لگایا ؟ اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ دونوں سلطنتوں میں اس روایت نے بیک وقت جنم لیا ہو۔ کیا تورات پر مر مٹنے والی اور اپنے اجداد کے کارناموں پر نازاں قوم نے اپنی روایت کی حفاظت سے بالکل ہی آنکھیں بند کرلیں ؟ اور پھر ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا جبکہ شمالی سلطنت اس بات کی دعویدارتھی کہ انبیا کی وراثت اسی کا حق ہے اور اسی بنا پر اس نے اپنے لیے''اسرائیل'' کا نام تجویز کیا تھا؟ کیا عبادت، قربانی، عید اور دیگر تہواروں پر اس سلطنت کے لوگوں نے اپنے مذہبی احکام سرے سے نظر انداز کردیے تھے؟ شمالی سلطنت میں جو پیغمبر مبعوث ہوئے انھوں نے کیا اس طرف کوئی توجہ نہیں دی؟ یہ کیا کہ جنوبی سلطنت کی روایت ہی کو لے کر اس میں جابجا اضافے اور ترمیم کرکے اسے''تورات'' مان لیا؟ کیا یہ ڈھائی سو سال کا عرصہ یہ سلطنت تورات سے بالکل ہی محروم رہی؟ ان سب سے بڑھ کر حیرت کا باعث یہ امر ہے کہ شمالی سلطنت تو ۷۲۲ ق م میں ختم ہوگئی تھی۔ کیا سلطنت کے ختم ہونے کے بعد، جبکہ وہاں آباد قبائل تتر بتر ہوگئے، انہوں نے اپنی روایت تحریر کی؟

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر J جنوبی سلطنت کی روایت ہو اور E شمالی سلطنت کی، تو کیا جنوبی سلطنت کے لوگ خدا کی تجسیم کے قائل تھے اور شمالی سلطنت کے لوگ ان کے برعکس خدا کی تنزیہہ کے قائل تھے؟ کیا اسرائیلی مذہب میں اس طرح کی دوئی کا کوئی تاریخی ثبوت ہے؟

استثنائی دستاویز(D) کے متعلق کہاجاتا ہے کہ یہ JE کے وجود میں آنے کے بعد لکھی گئی اور پہلے شمالی سلطنت میں رائج رہی۔ اس کے بعد ۶۲۲ء میں جنوبی سلطنت کے بادشاہ یوسیاہ نے اسے اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ سوال یہ ہے کہ JE کے وجود میں آنے کے بعد شمالی سلطنت باقی ہی کہاں رہی تھی کہ یہ دستاویز پہلے وہاں گردش کرتی ؟ کیا اس کے برعکس یہ کہنا زیادہ مناسب نہیں کہ یہ دستاویز یا اس کا غالب حصہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی مستند تعلیم پر مبنی تھا اور اسی وجہ سے دونوں سلطنتوں میں یہ دستاویز قابل قبول تھی ؟ تاہم اگر یہ بات مان لی جائے تو دستاویزی نظریے کی ساری عمارت ہی دھڑام سے گر جاتی ہے۔ ان کا تو کہنا یہ ہے کہ اس دستاویز کو JE کے ساتھ ضم کرنے میں تقریباً ایک صدی کا عرصہ لگا اور یوں JED کی صورت ۵۵۰ ق م کے لگ بھگ بن گئی۔ سوال یہ ہے کہ جب D تصرف سِفر استثنا میں ہی پایاجاتا ہے

اور تورات کے دیگر اسفار میں اس کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہے تو پھر JE کے ساتھ اس کے انضمام نے اتنا زیادہ عرصہ کیوں لیا؟ اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ۵۸۷ ق م میں تو سلطنت یہوداہ کا بھی خاتمہ ہوچکا تھا، تو کیا JED نے بابل جلاوطنی کے دوران میں جنم لیا ؟

دستاویزی نظریے کا ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ ''فقہی ماخذ'' (P) کے JED کے ساتھ انضمام کا مرحلہ ایک صدی سے زائد عرصے میں طے ہوا اور چوتھی صدی قبل از مسیح میں JEDP یا موجودہ اسفار خمسہ وجود میں آگئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فقہی احکام کیا بابل جلاوطنی کے بعد وجود میں آئے یا اس سے صدیوں پہلے سے ان کے استنباط اور ان پر عمل کا سلسلہ جاری تھا ؟ تو کیا پہلے یہ سارے احکام زبانی روایت کی صورت میں تھے اور اب ان کو تحریری شکل دے کر انھیں ''تورات'' کا حصہ بنا دیا گیا؟

پس دستاویزی نظریہ چند سوالات کا جواب تو دے دیتا ہے لیکن بہت سے نئے سوالات کو جنم دیتا ہے اور بہت سے سوالات کے جوابات تشنہ چھوڑ دیتا ہے۔ البتہ اس نظریے سے اتنی بات ضرور ثابت ہوجاتی ہے کہ اسفار خمسہ میں یہودی علما کے فتاوی اور استنباطات بھی شامل ہوگئے ہیں۔ فقہی فروعات کی تفصیلات، قربانیوں، عبادات، کفارات اور نذر کے مسائل، لمبے چوڑے شجرہائے نسب اور اعداد و شمار والی آیات، جنہیں یہ محققین P سے تعبیر کرتے ہیں، دراصل یہودی فقہا اور احبار کے اضافے ہیں جو دانستہ یا نادانستہ متن میں داخل کردیے گئے ہیں۔

اسی طرح مغربی محققین کی تحقیق سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ اسفار خمسہ اور دیگر صحف تحریری شکل میں آنے سے پہلے زبانی روایات کی شکل میں تھے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ بعض زبانی روایات تحریری صورت میں اسفار خمسہ کا حصہ نہ بن سکی ہوں۔ ان میں بعض بعد میں تلمود میں جگہ پا گئیں اور بعض زبانی روایات ہی کی صورت میں باقی رہیں۔ اسی طرح بعض صحائف یا ان کے کچھ حصے ضائع ہوگئے۔ یہودی بائبل نے بابل جلاوطنی کے بعد موجودہ شکل حاصل کی جسے اصطلاحاً Canon کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''یہودی مذہب'' اور ''یہودی روایات'' نیز ''یہودی نفسیات'' نے ایک مستحکم شکل اختیار کر لی۔ (۵۵)

۵۵- تفصیلات کے لیے دیکھیے : *Introduction to the Old Testament*, pp 2-5 and 431-76

فصل چہارم:

مسلمان اہل علم کے لیے سوالات

اسفار خمسہ کی تدوین کے متعلق دستاویزی نظریہ مسلمان اہل علم کے لیے قرآن و حدیث کے حوالے سے بھی کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً کئی واقعات ایسے ہیں جو بائبل اور قرآن دونوں میں موجود ہیں۔ پھر چونکہ بائبل میں ایک ہی واقعے کے متعلق کئی روایات پائی جاتی ہیں اس لیے بعض اوقات ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ قرآن میں بیان شدہ واقعہ بائبل کی ایک روایت کے ساتھ موافقت اور دوسری کے ساتھ اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں، ظاہر ہے، مسلمان اہل علم اس روایت کو ترجیح دیں گے جو قرآن و حدیث سے موافقت رکھتی ہو۔ تاہم مسئلہ یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ بعض اوقات بائبل کی یہ روایت ان مغربی محققین کی تحقیق کے مطابق اس ماخذ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ E سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اوقات قرآن و حدیث سے موافقت والی روایت J یا P یا D سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو صحیح بخاری کی روایت کے مطابق خدا کا فرشتہ نظر آیا تھا جس نے انھیں تسلی دی۔[۵۶] سفر پیدائش میں دو روایات ملتی ہیں : ایک صحیح بخاری کی روایت کے موافق ہے، جبکہ دوسری کے بموجب انھیں خدا دکھائی دیا تھا۔[۵۷] مغربی محققین اول الذکر کو E سے اور ثانی الذکر کو J سے منسوب کرتے ہیں۔ گویا یہاں ماخذ E کی روایت حدیث کے موافق ہے۔ لیکن ذبیح کے واقعے میں جہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کا نام بطور ذبیح لیا گیا ہے وہ بھی ان محققین کے نزدیک E سے ماخوذ ہے۔[۵۸] لیکن قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔[۵۹] پس اگر کہیں قرآنی بیان اس دستاویزی نظریے سے مطابقت رکھتا ہو تو وہ محض ایک اتفاقی امر ہوگا۔

نیز یہ سوال بھی قابلِ غور ہے کہ کیا مسلمان اہلِ علم ان نتائج کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں جو ان نظریات کی عملی تطبیق سے پیدا ہوتے ہیں ؟ اگر اس قسم کے نظریات قرآن کریم پر منطبق کیے گئے تو مسلمان

۵۶- صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ : و اتخذ اللہ ابراهیم خلیلاً

۵۷- پیدائش: باب ۱۶، آیات ۱۳۔۱۴

۵۸- *Introduction to the Old Testament*, P 43

۵۹- تفصیل کے لیے دیکھیے : ذبیح کون ہے ؟

اہل علم اس کا کیا جواب دیں گے ؟(۶۰) کیا وہی جواب بائبل کی طرف سے بھی نہیں دیا جاسکتا ؟

آل فرعون پر بھیجے جانے والے عذاب: مغربی محققین کی حیرت اور قرآن مجید کی رہنمائی

یہاں ہم تورات کے اختلاف روایت کے متعلق صرف ایک مثال ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ واضح کیا جائے کہ دستاویزی نظریہ اس قسم کے مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے اور قرآن مجید کی روشنی میں اس کا کیا حل پیش کیا جاسکتا ہے ؟ مسئلہ آل فرعون کی غرقابی سے قبل ان پر بھیجے جانے والے مختلف عذابوں کی تعداد اور نوعیت کا ہے۔

سفر خروج کے مطابق آل فرعون پر دس مختلف نوعیت کے عذاب بھیجے گئے :

۱- پانی کا خون بن جانا ۲- مینڈکوں کی کثرت

۶۰- یہ محض مفروضہ ہی نہیں بلکہ درحقیقت اس قسم کے نظریات قرآن اور حدیث پر بھی منطبق کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے :

Joseph Shacht, *Origins of Muhammad Jurisprudence*(Oxford, Clarendon Press, 1950

جوزف شاخت کے جواب میں مسلمان اہل علم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اسلامی قانون اور فقہ کے متعلق ان نظریات کے مفصل رد کے لیے دیکھیے :

Imran Ahsan Khan Nyazee, *Theories of Islamic Law:* The Methodology of Ijtihad (Islamabad: Islamic Research Institute, 1994)

نیز دیکھیے :

Muhammad Mustafa al-Azami, *On Schacht's Origins of Muhammadan Jurisprudence* (Cambridge: Islamic Texts Society, 1985)

حدیث کی حجیت اور صحت کے متعلق جوزف شاخت کے نظریے پر علمی تنقید کے لیے دیکھیے :

Muhammad Mustafa al-Azami, *Studies in Early Hadith Literature*(Lahore: Sohail Academy, 2001)

اس طرح کے نظریات کی بنیاد پر "قرآن کے مآخذ" کی تلاش کے متعلق بھی مفروضات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے :

Montgomery Watt, *Muhammad at Mecca* (Karachi: Oxford University Press, 2004), pp 39-59

۳- مچھروں کی کثرت ۴- مکھیوں کی کثرت

۵- مویشیوں کی ہلاکت ۶- وبائی پھوڑے

۷- اولے پڑنا ۸- ٹڈیاں

۹- پورے ملک پر اندھیرا چھا جانا اور

۱۰- قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولاد کی موت۔ (۶۱)

دستاویزی نظریے کے ماننے والوں کے نزدیک یہ آیات تین مختلف مآخذ۔ J, E, P ۔ سے لی گئی ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسفار خمسہ کے چوتھے مزعومہ ماخذ D سے منسوب آیات میں ان عذابوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ ہر ماخذ میں مذکور عذابوں کی تفصیل یہ ہے :

یہوی ماخذ میں مذکور عذاب

اس ماخذ سے منسوب آیات میں سات عذاب مذکور ہیں:

۱- پانی کا خون بن جانا ۲- مینڈکوں کی کثرت

۳- مکھیوں کی کثرت ۴- مویشیوں کی ہلاکت

۵- اولے پڑنا ۶- ٹڈیاں ؛ اور

۷- قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولاد کی موت۔ (۶۲)

الوہی ماخذ میں مذکور عذاب

اس ماخذ سے منسوب آیات میں مندرجہ ذیل پانچ عذاب مذکور ہیں:

۱- پانی کا خون بن جانا؛ ۲- اولے پڑنا ؛

۳- ٹڈیاں ؛ ۴- پورے ملک پر اندھیرا چھا جانا ؛ اور

۵- قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولاد کی موت۔

فقہی ماخذ میں مذکور عذاب

اس ماخذ سے منسوب آیات میں یہ پانچ عذاب مذکور ہیں:

۶۱- خروج : باب ۷، آیت ۱۴ تا باب ۱۲، آیت ۳۲۔

۶۲- یہی سات قسم کے عذاب زبور میں بھی مذکور ہیں۔ (زبور ۷۸: آیات ۴۳۔۵۷)

۱- پانی کا خون بن جانا ۲- مینڈکوں کی کثرت
۳- مچھروں کی کثرت ۴- وبائی پھوڑے اور
۵- قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولاد کی موت۔

ہر ماخذ میں مذکور عذابوں کو الگ کیا جائے تو صورت کچھ اس طرح بنتی ہے کہ صرف دوقسم کے عذاب ایسے ہیں جو تینوں مآخذ میں مشترک ہیں اور وہ ہیں پانی کا خون بن جانا اور قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولاد کی موت۔ (۶۳)

قرآن مجید میں مذکور عذاب

اب دیکھئے کہ قرآن مجید میں کن عذابوں کا ذکر ہے اور وہ ان میں کسی ماخذ کے ساتھ موافقت رکھتا ہے یا اس کے بیان کی حیثیت بالکل ہی الگ ہے؟ سورۃ الاعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ﴾ [سورہ الاعراف:۱۳۰]

(اور ہم نے آل فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو۔)

آگے مزید عذابوں کا تذکرہ یوں آیا ہے:

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ﴾[سورہ الاعراف:۱۳۳]

(تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، واضح کی ہوئی نشانیاں۔ پس انہوں نے تکبر کیا، اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔)

یہ کل سات عذاب ہوئے:

۱- قحط سالی ۲- فصل کی کمی
۳- طوفان ۴- ٹڈی
۵- خون چوسنے والے حشرات ۶- مینڈک؛ اور
۷- خون۔

۶۳- Introduction to the Old Testament, pp 128-29

پس قرآن دس کے بجائے سات عذابوں کا ذکر کرتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں حضرت موسی علیہ السلام کو دی جانے والی نو آیات کا ذکر ہے :

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾[سورہ بنی اسرائیل: ۱۰۱]

(اور ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں۔)

آیات سے یہاں مراد نشانیاں یا معجزات ہیں۔(۶۴) سات نشانیاں تو سورۃ الاعراف کے حوالے سے اوپر ذکر کی گئیں، اور دو دیگر نشانیاں ید بیضاء اور عصا تھیں، جو عذاب کی نشانیاں نہیں تھیں لیکن اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کی نشانیاں ضرور تھیں۔ قرآن مجید اور اسفار خمسہ دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر لاٹھی کے ذریعے سمندر میں راستہ نکالا۔(۶۵) لاٹھی ہی کے ذریعے صحرا نوردی کے دور میں پتھروں سے چشمے پھوٹ نکلے تھے۔(۶۶) نیز اسفار خمسہ کی روایات تسلیم کی جائیں تو معلوم ہوتا

۶۴- بعض مفسرین نے ایک روایت کی بنیاد پر یہاں آیات سے معجزات کے بجائے احکام عشرہ مراد لیے ہیں اور یہ رائے قائم کی ہے کہ دسواں حکم سبت کا تھا جو بنی اسرائیل سے مخصوص تھا۔ (سنن الترمذی، کتاب الاستئذان، باب ما جاء فی قبلة الید و الرجل) تاہم سیاق کلام اور نظم آیات کی قطعی گواہی یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور نو نشانیوں سے مراد نو معجزات ہی ہیں، نہ کہ نو احکامِ شریعت۔ سورۃ النمل میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ سیدنا موسی علیہ السلام کو نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا گیا تھا۔

﴿فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ﴾[سورہ النمل:۱۲] [نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کی طرف]

یہ ایک معلوم اور مسلم حقیقت ہے کہ احکام عشرہ کا نزول مصر سے ہجرت کے بعد ہوا۔ اس لیے ان احکام کے ساتھ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور ان کے درباریوں کی طرف نہیں بھیجا گیا تھا۔ جہاں تک مذکورہ روایت کا تعلق ہے تو وہ متن کے لحاظ سے بھی مضطرب ہے اور سند کے لحاظ سے بھی کمزور ہے۔ اس روایت کی تمام اسناد شعبہ عن عمرو بن مرۃ عن عبد اللہ بن سلمہ عن صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ پر مل جاتی ہیں۔ ابن حجر نے شعبہ سے عبد اللہ بن سلمہ کے متعلق عمرو بن مرۃ ہی کا یہ قول نقل کیا ہے : کان عبد الله بن سلمة یحدثنا فیعرف و ینکر، کان قد کبر. شہاب الدین ابو الفضل احمد بن محمد ابن حجر العسقلانی، تہذیب التہذیب، تحقیق ابراھیم الزیبق و عادل مرشد، (مؤسسۃ الرسالۃ)، ج۲، ص ۳۴۸) [عبد اللہ بن سلمہ ہم سے حدیث بیان کرتے تھے تو کبھی ٹھیک بیان کرتے اور کبھی انوکھی چیزیں بیان کرتے۔ وہ بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔] یہی جرح ان پر امام ابو حاتم الرازی نے کی ہے۔ (ایضاً) امام بخاری نے ان کے متعلق کہا تھا: لا یتابع فی حدیثه۔ (ایضاً) [اس کی روایت کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔] یہی عبد اللہ بن سلمہ تنہا اس حدیث کو حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں

۶۵- الشعراء : آیت ۶۳ ؛ خروج باب ۱۴، آیات ۱۵-۳۱

۶۶- البقرۃ : آیت ۶۰

ہے کہ مختلف قسم کے عذاب آنے میں بھی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا اہم کردار رہا ہے۔(۶۷) اسی طرح ید بیضاء اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم الشان نشانی تھی جس کے ذریعے فرعون پر حجت قائم کی گئی اور وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے خلاف اقدام کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔(۶۸)

اب اگر دستاویزی نظریے کے بجائے قرآن کی روشنی میں اس امر کا جائزہ لیا جائے تو اسفار خمسہ میں مذکور دس عذابوں کی تاویل یوں کی جاسکتی ہے کہ مکھیوں اور مچھروں کو القمل کا مصداق سمجھ کر انھیں ایک ہی عذاب کہا جائے ؛ وبائی پھوڑے بھی انھی حشرات کے پھیل جانے کا نتیجہ ہوں گے ؛ اسی طرح پورے ملک پر اندھیرا چھا جانے اور اولوں کو الطوفان ہی کے عذاب میں شامل سمجھا جاسکتا ہے ؛ اور مویشیوں کی ہلاکت کو السنین اور نقص من الثمرات کا لازمی نتیجہ سمجھ کر انھی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ایک عذاب ایسا ہے جسے بائبل نے بڑی شد و مد کے ساتھ ذکر کیا ہے اور جو مغربی محققین کے مزعومہ تمام مآخذ میں مذکور ہے، لیکن

۶۷- مثلاً صحیفۂ خروج میں مذکور ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ہاتھ میں لی اور دریا پر ہاتھ بڑھا دیا تو سارا پانی خون میں تبدیل ہوگیا۔ (خروج : باب ۷، آیات ۱۷- ۲۱)

۶۸- سِفر خروج کی روایت (باب ۴، آیت ۶) میں مذکور ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ برص کے مریض کی مانند سفید نظر آتا۔ قرآن مجید نے ید بیضاء کے معجزے کے متعلق تصریح کی ہے کہ اس کی صورت یہ نہیں تھی۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ید بیضاء کے ساتھ من غیر سوٓء کی قید لگی ہوئی ہے۔ یہ دراصل خروج میں مذکور روایت کی تردید اور تصحیح ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کو عموماً معجزات اس وقت دیے گئے جبکہ قوم کو نبی نے دلائل اور حجت سے قائل کیا ہوتا مگر اس قوم کے سرکش لوگ بار بار معجزہ طلب کرتے۔ پھر گویا اتمام حجت کے لیے انہیں معجزہ دکھا دیا جاتا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر سات عذاب اسی طرح کے معجزات تھے، لیکن ید بیضاء اور عصا کے معجزات کی نوعیت مختلف تھی۔ یہ معجزات بالکل پہلے ہی مرحلے میں فرعون تک پیغام پہنچانے سے بھی پہلے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی کہتے ہیں:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسے سرکش اور جابر حکمران کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو شخصی اور قومی دونوں اعتبار سے حضرت موسیٰ کا جانی دشمن تھا۔ ان کی بات سننا اور سمجھنا تو درکنار اندیشہ اس بات کا تھا کہ یہ علم ہوتے ہی کہ یہ حضرت موسیٰ ہیں فوراً ان کے قتل کا حکم دے دیتا، بلکہ ان کے قتل کا حکم تو اسی وقت دے چکا تھا جب قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ چھپ کر مدین چلے گئے اس وجہ سے وہ اپنے ارادے میں ناکام رہا۔ ایک ایسے منتقم و جبار کے سامنے اگر حضرت موسیٰ ایک رسول کی حیثیت سے انذار کے لیے جاتے تو بھلا وہ ان کی بات سننے کا کب روادار ہوتا ! وہ تو صرف اسی شکل میں کوئی بات سننے کے لیے تیار ہوسکتا تھا جب حضرت موسیٰ کے ہاتھوں کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی جو اس کو مرعوب کردیتی۔'' (تدبر قرآن۔ ج ۵، ص ۳۶)

قرآن نے ان کا ذکر نہیں کیا، اور وہ ہے قبطیوں اور ان کے جانوروں کی پہلوٹھی اولا د کی موت۔ اسرائیلی نفسیات میں پہلوٹھی اولاد کی خصوصی حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ بات اصل روایت میں بعد میں اضافہ کی گئی ہے۔[۶۹]

اسی طرح اگر قرآن مجید میں مذکور عذابوں کی ترتیب کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ اسی ترتیب سے یہ

۶۹- یہودی نفسیات میں پہلوٹھی اولاد اور پہلوٹھے کے حق کو خصوصی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ خصوصیت زمین میں ہونے والی پہلی فصل اور درختوں کے پہلے پھل کو بھی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ یہودی روایات میں مذکور ہے کہ پہلوٹھے بچے کو باپ کی ''قوت اور شہ زوری کا پہلا پھل'' کہا جاتا تھا۔ (پیدائش: باب ۴۹، آیت ۳) باپ کی عدم موجودگی میں پہلوٹھے بیٹے کو باپ کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا اور اسے بہن بھائیوں پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ (پیدائش : باب ۳۷، آیت ۲۲) پہلوٹھے بیٹے کو دوسرے بیٹوں سے دگنی وراثت دی جاتی تھی۔ (۲۔ سلاطین : باب ۲، آیت ۹) شاہی خاندان میں پہلوٹھے بیٹے کو باپ کی موت کی صورت میں بادشاہت کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔ (۲۔ تواریخ : باب ۲۱، آیات ۱-۳) ''پاک'' جانوروں کے نر پہلوٹھوں کی قربانی کا حکم تھا۔ (گنتی : باب ۱۸، آیات ۱۷۔۱۸) ''ناپاک'' جانوروں کے نر پہلوٹھوں کو بھی فدیہ دے کر چھڑانا ہوتا تھا۔ پہلوٹھے بچے کی اس خصوصی حیثیت کی وجہ سے اسے استعارے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً بنی اسرائیل کو خدا کا ''بیٹا بلکہ پہلوٹھا'' کہا گیا۔ (خروج : باب ۴، آیت ۲۲)

اس سارے پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ مصریوں کے پہلوٹھوں کی ہلاکت کی کہانی بھی بعد میں وضع کی گئی تھی۔ اسے مصر سے خروج کے واقعے کے ساتھ اس طرح ملالیا گیا کہ پہلی فصل کے تہوار (پینٹی کوسٹ) کی وجوہات میں اس واقعے کو بھی ذکر کردیا گیا۔ (خروج: باب ۱۲، آیات ۲۱۔۲۸) حالانکہ بنی اسرائیل کی مجاور دیگر قوموں میں بھی اس تہوار کا دستور رہا ہے۔ اس لیے اسے مصر سے خروج کے ساتھ متعلق کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے :

Introduction to the Old Testament,pp 149-50; H. H. Rowley (ed.), *Peake's Commentary on the Bible*(London: Thomas Nelson Ltd, 1967), 193

قرآن مجید نے انبیائے بنی اسرائیل اور موسوی شریعت کی طرف کئی تلمیحات اور اشارات کیے ہیں اور کئی مواقع پر بعض تفصیلات بھی دی ہیں، لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ پہلوٹھے بچے کے متعلق اس خصوصی قانون کو قرآن مجید نے کہیں بھی شریعت کا حکم نہیں قرار دیا، نہ ہی اسے انبیاء کی تعلیمات میں کہیں ذکر کیا ؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو اس کے ذکر کرنے کا سب سے مناسب مقام غالبًا یہی تھا کہ آل فرعون پر آنے والے عذابوں کے ضمن میں اس کا بھی تذکرہ کیا جاتا۔ لیکن جس شد و مد سے سِفر خروج میں اس کا تذکرہ ہوا ہے اس کے بعد قرآن مجید میں اس کے عدم ذکر کو انگریزی محاورے کے مطابق conspicuous by absence ہی کہیں گے۔ اسفار خمسہ اور بائبل کے دیگر صحف کے تحقیقی مطالعے سے بھی معلوم یہی ہوتا ہے کہ پہلوٹھے کو یہ خصوصی حیثیت بہت بعد میں دی گئی

عذاب وقوع پذیر ہوئے تو یہ بالکل یکے بعد دیگرے آنے والی آفتوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔سورۃ الزخرف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آفتوں میں سخت سے سخت عذاب کی طرف ایک ارتقا کی صورت تھی :

﴿وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ ايَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾[سورہ الزخرف:۴۸]

(اور ہم ان کو ایک کے بعد دوسری اس سے بڑی نشانی دکھاتے رہے، اور ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا تا کہ وہ رجوع کریں۔)

صورت واقعہ کچھ یوں بن جاتی ہے کہ گویا پہلے خشک سالی اور بارشوں کی کمی کی وجہ سے فصل میں کمی اور قحط کی صورت بن گئی۔ پھر مسلسل بارشوں اور طوفان بادوباراں اور اولے پڑنے کی وجہ سے رہی سہی فصل بھی تباہ ہوگئی۔ اس کے بعد ٹڈی دل کا عذاب آیا اور پھر بارشوں کی کثرت کی وجہ سے مچھروں، مکھیوں اور مینڈکوں کی بہتات ہوگئی۔ یقیناً اس صورتحال میں وبائی پھوڑے بھی نکل آئے ہوں گے۔ پھر بالآخر خشکی اور سمندر کے بہت سے جانوروں کی ہلاکت کی وجہ سے ہر طرف خون ہی خون اور بدبو پھیل گئی۔ یہ سارے عذاب اس سنت اللہ کی تکمیل کے طور پر آئے جو رسولوں کے مکذبین پر اتمام حجت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے جاری کی۔[۷۰]

﴿وَ لَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾[سورہ السجدہ: ۲۱]

(اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا قریب کے عذاب میں سے بھی کچھ چکھائیں گے تا کہ یہ رجوع کریں۔)

پھر جب ان ایک سے بڑھ کر ایک سخت عذابوں سے بھی آل فرعون نے سبق نہیں سیکھا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا :

۷۰- فرعون پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حجت تمام کرنے کی اس سرگزشت کے متعلق قرآنی آیات کی مختصر مگر دلچسپ تشریح کے لیے دیکھیے : اخلاق حسین، معرکۂ فرعون وکلیم (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز)

یہودی تاریخ پر قرآنی آیات کی روشنی میں بحث کے لیے دیکھیے: سید ابو الاعلیٰ مودودی، **یہودیت و نصرانیت قرآن کی روشنی میں**، مرتبین نعیم صدیقی اور عبد الوکیل علوی (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز)

رسولوں کے مکذبین کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنتوں کے بیان کی وضاحت کے دیکھیے: اصلاحی، **تدبر قرآن**، ج ۲، ص۴۳۲؛ دعوت دین اور اس کا طریق کار، لاہور : فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۹ء، ص ۴۸-۶۵

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا﴾[سورہ بنی اسرائیل: ۱۰۱-۱۰۳]

(اور ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں۔ پھر بنی اسرائیل سے ہی پوچھ لو جب کہ وہ ان پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ! میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے، آنکھیں کھول دینے کے لیے، اور میں تو تم کو اے فرعون ! ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ ان کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کردیا۔)

پس مسلمان اہل علم پر لازم ہے کہ وہ اسفار خمسہ پر تنقید کے سلسلے میں خود اسلامی اصولوں کی روشنی میں ایک نظریہ (یا نظریات) پیش کریں اور اسفار خمسہ کی عبارات میں غث وسمین کی تمیز، نیز ''اصل تورات'' کی بازیافت کے لیے کسوٹی سامنے لائیں۔ ایک ابتدائی قدم کے طور پر اسی مآخذ کے نظریے سے مدد لی جاسکتی ہے لیکن وہ محض ابتدائی قدم ہی ہوگا۔ ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔

❁❁❁❁❁

اشتہار